ذات کا قرض

امجد جاوید

جمہوری پبلی کیشنز

ISBN:978-969-8455-52-1

نام کتاب: ذات کا قرض

مصنف: امجد جاوید

اشاعت: اگست 2010ء

سرورق: مصباح سرفراز

ناشر: جمہوری پبلی کیشنز لاہور

قیمت: 200 روپے

اہتمام اشاعت: فرخ سہیل گوئندی

ملنے کا پتہ:

جمہوری پبلی کیشنز

2- ایوان تجارت روڈ- لاہور- پاکستان

فون: 042-36314140

انتساب

سیاسی ورکرز کے نام

جو اصل جمہوریت کے علمبردار ہوتے ہیں

اور

جن کے دم سے جمہوریت کی بقا ہے

پاکستان میں لکھے جانے والے ادب میں یہاں کا سیاسی منظر نامہ اور استحصالی سیاسی نظام کم ہی پڑھنے کو ملتا ہے خصوصاً پچھلے ساٹھ سالوں میں یہاں پر برپا عوامی تحریکوں میں درمیانے اور نچلے طبقے کے لوگوں نے جو جدوجہد کی اور اس دوران جن ناقابل یقین حالات کا مقابلہ کیا اس کا کہیں ذکر ہی نہیں ملتا۔

سیاسی جدوجہد میں شامل چھوٹے طبقات کے لوگ سماج میں تبدیلی کیلئے متحرک ہوتے ہیں ان کا مفاد حکومت و اقتدار نہیں ہوتا وہ اجتماعی تبدیلی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ پاکستان کا سماجی ڈھانچہ سرداری اور جاگیرداری نظام کی ظالمانہ بنیادوں پر کھڑا ہے اور اس کی کرختگیوں کا جتنا علم سیاسی تحریکوں میں شامل کارکنوں کو ہوتا ہے، اس قدر

شاید ہی کسی اور کو ہوتا ہو۔ معاشرے کے یہ لوگ دوسروں کیلئے لڑتے لڑتے خود فنا ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے قومی ہیروز میں دانشور، سیاسی رہنما، فوجی جرنیل، کھلاڑی اداکار، صحافی، شاعر، سائنس دان اور حکمران تو شمار کیے جاتے ہیں لیکن افسوس کہ کسی ایک بھی سیاسی کارکن کو قومی ہیروز کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا اور افسوس یہ کہ ہمارے ادیبوں کے قلم بھی اس موضوع پر خاموش رہے۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد درجنوں یا سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے۔ میں ذاتی طور پر سیکڑوں سیاسی کارکنوں کی ناقابل یقین جدوجہد سے آگاہ ہوں اگر ان میں سے چند ایک کوئی اہل قلم منظر عام پر لے آئیں تو جہاں یہ سیاسی کارکن تاریخ میں زندہ ہو جائیں گے وہیں پر ایک شاندار ادب بھی تخلیق ہو جائے گا۔ اور یوں سماج کے وہ لوگ ہمارے ادب کا حصہ بن سکتے ہیں جو کہ سارے سماج کی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ زیر نظر کتاب "ذات کا قرض" اسی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ جس کو برادرم امجد جاوید نے تحریر کر کے اس سفر کا آغاز کیا ہے۔ جس کا ذکر درج بالا سطور میں کیا گیا ہے۔

فرخ سہیل گوئندی

27 جولائی 2010ء

لاہور

☆☆☆

"تو پھر کیا سوچا تم نے؟" جعفر نے فہد کے اسپاٹ چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ فہد اپنے ہی گھر کے بجائے ڈرائنگ روم میں اجنبیوں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی طویل سفر پر جانے کی تیاری کر چکا ہے۔

جعفر نے اپنا سوال دہرایا تو وہ بولا "وہی جو تمہیں معلوم ہے۔"

چہرے کی طرح اس کا لہجہ بھی ہر تاثر سے عاری تھا۔

"یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے؟" جعفر نے افسوس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔"

"تو پھر تم واقعی احمق ہو۔ بے وقوف کو سمجھایا جا سکتا ہے، احمق کو نہیں۔" جعفر نے

غصے میں کہا۔ وہ اس کے رویے پر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ دکھ بھی محسوس کر رہا تھا

جبکہ فہد ایخالی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

کتنے ہی لمحے ان کے درمیان خاموشی حائل رہی۔

"دیکھو! تمہارا مستقبل یہیں ہے۔ تعلیم مکمل کرتے ہی تمہیں بہترین جاب کی پیشکش ہوئی ہے۔ یہ جاب تمہیں ہر طرح کے معاشی فکر سے آزاد کر دے گی۔ ایسا بہت کم لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔"

"معاش میرا مسئلہ نہیں ہے۔ اس بات کا تمہیں بخوبی علم ہے۔" فہد نے بیزاری سے اس کی دلیل رد کر دی۔

"اور مارٔہ؟ بھول گئے کہ وہ تمہیں چاہتی ہے۔ اسکے والدین راضی ہیں۔ وہ کوئی تم پر ترس نہیں کھا رہے بلکہ تمہاری صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ انہیں اطمینان ہے کہ مارٔہ تمہارے ساتھ سکھی رہے گی۔ پھر بھی ......" جعفر نے افسوس بھرے انداز میں کہا اور دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس نے یہ دلیل اس لیے دی تھی کہ وہ سارا معاملہ جانتا تھا۔

"جعفر! یہ اُس کا معاملہ ہے میرا نہیں۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اسے اچھا دوست سمجھا ہے۔"

"تمہیں ذرا پروا نہیں کہ وہ تمہارے بارے کیا خیالات رکھتی ہے؟" جعفر کے لہجے میں استعجاب گھل گیا۔

"اوہو! کیا بات پکڑ بیٹھے ہو۔ اب میں اس پر پابندی تو نہیں لگا سکتا کہ وہ کیا سوچتی

ہے اور کیا نہیں۔ اور پھر یار! ...... کیا محبت کی زنجیر سے کسی کو باندھا جا سکتا ہے؟ ویسے بھی مارزہ کے والدین اپنی بیٹی کا تحفظ سوچیں گے ناں ...... میرا کوئی آگے ہے، نہ پیچھے۔" فہد نے اُسے مطمئن کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ "مارزہ نے جب بھی قدم بڑھائے، میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"تم یہاں پر اپنا گھر نا چھے ہو۔ اپنی پرسکون زندگی کی شروعات کر سکتے ہو۔ اتنا بڑا گھر تم ان لوگوں کے حوالے کر کے جا رہے ہو جو اتنے بڑے گھر میں رہنے کا تردد بھی نہیں کر سکتے۔ اور وہ ......" وہ مزید کہنا چاہ رہا تھا مگر فہد نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"وہ کوئی انجان لوگ نہیں، میرے محسن ہیں۔ آج میں جو کچھ ہوں، انہی کے وسیلے سے ہوں۔ ورنہ میں بھی کسی چھوٹی موٹی نوکری کے لیے دھکے کھا رہا ہوتا۔ پروفیسر رازی صاحب نے ہی تو مجھے اس مقام پر پہنچنے میں مدد دی ہے۔ ایسے کئی گھر ان کے جوتوں پر قربان کیے جا سکتے ہیں میرے دوست!" فہد نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا، پھر فوراً ہی بولا "یار ...... تم یہ بتاؤ! کیا یہ باتیں مجھ پر اثر انداز ہو سکتی ہیں؟"

"وہی تو ...... تم جیسے شخص سے اس قدر احمقانہ فیصلے کی توقع نہیں تھی۔ جو کچھ تم کرنے جا رہے ہو اور جیسا تم نے سوچا ہے ...... ایسا فلموں، ڈراموں یا پھر قصے کہانیوں میں ہی اچھا لگتا ہے۔ حقیقی زندگی میں اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ تمہارے جیسا بندہ اتنا غیر حقیقی فیصلہ کرے گا۔ فہد! ماضی کو دفن کر کے بھول جانا بہتر ہوتا ہے۔ تمہارے ساتھ جو ہوا تھا، اس نے تمہاری آدھی زندگی نگل لی تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تمہاری زندگی بن گئی جسے تم اپنے ہاتھوں گنوا دینا چاہتے ہو۔ انتقام لینے کے چکر

میں باقی زندگی بھی خراب کر دو گے۔" جعفر نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

فہد نے بڑے سکون سے سنا، پھر ایک طویل سانس لے کر بولا: "تمہیں یہ معلوم ہے نا کہ تم ہی وہ واحد شخص ہو جس سے میں اپنے دل کی باتیں کر لیتا ہوں۔ ایسی باتیں جو میں نے کبھی مائرہ سے بھی نہیں کہیں۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے حوصلہ دینے کے بجائے بزدلی کا درس دو۔ میں نے فیصلہ آج نہیں کیا بلکہ میرے اس فیصلے میں آدھی زندگی خرچ ہو گئی ہے۔ اب چونکہ فیصلے پر عمل کا وقت آ گیا ہے اور مجھے بہر حال جانا ہو گا۔"

"چاہے تمہاری جان چلی جائے۔ کیا وہاں تمہارے بے دردی سے قتل کروائے جانے کا کوئی امکان نہیں؟ کیا تم نے سوچا کہ دشمنوں کے چنگل میں پھنس کر اکیلے کیا کرو گے؟" وہ غصے میں پھنکارتا ہوں بولا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ فہد اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

"بے شک! یہ سارے خطرے موجود ہیں۔ میرے مر جانے پر کہانی ہی ختم ہو جائے گی نا...... مگر مجھے بتاؤ! یہاں شہر میں رہتے ہوئے کیا موت نہیں آ سکے گی؟ کیا یہاں بندے نہیں مرتے؟...... یہاں جنازے نہیں اُٹھتے؟" فہد پھر جذباتی ہو گیا تھا تو جعفر نے کہا، "بے شک موت سے فرار نہیں، موت تو آتی ہے، برحق ہے مگر......"

فہد نے بات اُچک لی، کہا، "مگر کیا......! جو ٹلنے والی نہیں، جسے آنا ہی آنا ہے...... اس سے ڈرنے کی کیا ضرورت...... وہ کیسی بھی آ سکتی ہے۔ اور بحیثیت مسلمان، ہمارا ایمان تو یہ ہے نا کہ موت اور زندگی محض میرے سوہنے رب کے ہاتھ میں

ہے۔ بندے نے جتنی سانسیں اس دنیا میں لینی ہیں، اس سے کوئی ایک سانس بھی کم نہیں لے سکتا، اور ساری دنیا کے خزانے خرچ کرنے پر ایک سانس بھی زائد نہیں لے سکتا اس لیے میری جان مجھے موت کا خوف مت دو۔ وہ بندہ جو ایک ہی زندگی میں نجانے کتنی بار مر کر زندہ ہوا ہو، اس کے نزدیک موت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔" فہد نے دبے دبے جوش سے کہا۔

"تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو...... تم نے انتقام کی بات کی ہے؟...... اور یہ بھی کہا ہے کہ میرا فیصلہ قصے کہانیوں جیسا ہے...... ذرا سوچو! تم نے آج تک جتنے بھی قصے کہانیاں یا فلمیں دیکھی ہیں، ان میں ساری صورت حال فتح مکہ سے پہلے جیسی ہوتی ہے...... کیا کبھی فتح مکہ کے بعد والی صورت حال بھی کسی نے پیش کی ہے؟ حالانکہ وہ خیالی یا ماورائی نہیں ہے۔ ایک حقیقت ہے۔ انسانی زندگی کی واحد مثال ہے جسے بڑے سے بڑا فاتح بھی پیش نہیں کر سکا اور نہ ہی اپنے اندر یہ حوصلہ پیدا کر سکا۔ ہم فتح مکہ کے بعد والی صورتحال کو کیوں نہیں سمجھ رہے ہیں۔ ہمارے موجودہ مسائل کی سب سے بڑی وجہ بھی شاید یہی ہے۔" فہد کہتا ہی چلا گیا۔

اس نے بڑے تحمل سے اپنی بات اُسے سمجھانا چاہی، "یار میں کیسے سمجھ سکتا ہوں کہ تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی تم نے بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم انہیں گنوا دو۔"

"یہ ساری کامیابیاں بھی اہمیت نہیں رکھتیں۔ یہ تو محض تیاری تھی، اس وقت کیلئے جو اب آگیا ہے...... اور جس کے لیے میں یہ سب چھوڑ چھاڑ کر جا رہا ہوں۔ تم

میرے ایسے مخلص دوست ہو جس پر آنکھیں بند کرکے اعتماد کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مائرہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ یہ جاب، یہ کامیابیاں...... یہ سہولیات سے بھری ہوئی زندگی...... ہر انسان کی طرح مجھے بھی اچھی لگتی ہے مگر میں زندہ رہنا چاہتا ہوں...... اس طرح کہ جیسے زندہ رہنے کا حق ہے...... میں مردہ اور بے ضمیر لوگوں کی زندگی نہیں گزار سکتا۔" اس نے بڑے تحمل سے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"یار...... میں تمہارا کیا کروں؟" جعفر نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کرتے ہوئے جوش سے کہا "یہ تم پھر فلسفیانہ باتیں کرنے لگے ہو۔ ارے یہاں رہتے ہوئے تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ یقیناً تمہیں وہاں رہنا چاہیے جہاں تم دوسروں کی مدد کر سکو۔"

"تم جو مرضی کہو۔ میں کسی کی سوچ، رائے یا خیال پر پابندی نہیں لگا سکتا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "یقیناً تم ناراض بھی نہیں ہو گے۔"

"ہوں! تم اگر مقتل میں کھڑے ہو کر آواز دو گے تو لبیک کہوں گا۔"

"مجھے اعتراف ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے مگر مجھے جانے دو اور حوصلہ شکنی کی باتیں نہ کرو۔" فہد نے کرب آمیز لہجے میں کہا یوں جیسے اندر کے زخم کھل گئے ہوں۔

تبھی جعفر نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں نہیں روکتا لیکن تم ایک وعدہ کرو۔"

"بولو!" اس نے طویل سانس لے کر خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"جب بھی تمہیں احساس ہو کہ میں ٹھیک کہتا تھا یا تمہارا فیصلہ درست نہیں تھا تب

لوٹ آؤ گے یا کم از کم ہمیں آواز ضرور دو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" فہد نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔ انہی لمحات میں فہد کا ملازم پلٹ کر آیا۔ اس نے سارا سامان گاڑی میں رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں اُٹھے اور پورچ میں آ گئے۔ فہد نے آسمان کی طرف دیکھا۔ نیلگوں آسمان پر ہلکے ہلکے سفید بادل اُڑ رہے تھے۔ مشرق کی طرف سورج خاصا اُٹھ آیا تھا۔ دن کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا۔ اس نے دونوں سے ہاتھ ملایا اور جعفر سے مخاطب ہو کر کہا،

"پروفیسر صاحب کا خیال رکھنا۔"

"ٹھیک ہے۔" جعفر نے کہا اور ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ تب اس نے دمیر سے کہا، "مارہ کا بھی خیال رکھنا۔ تم دونوں مجھے بہت یاد آؤ گے۔"

اس پر جعفر نے کوئی تبصرہ نہیں کہا۔ فہد اس سے الگ ہوا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

اوائل مارچ کا سورج ڈھلنے کیلئے سر جھکا چکا تھا۔ سہ پہر ہو چکی تھی جب وہ بڑی سڑک سے اپنے گاؤں جانے والی سڑک پر آ کر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس سڑک پر آتے ہی اس کے دل کی دنیا اتھل پتھل ہونے لگی۔ آگ، جو اندر برسوں سے لگی ہوئی تھی، حدت دینے لگی۔ وہ لمبی سانسیں لیتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ عجیب بات تھی کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک پیار بھری پھوار نے اس آگ کو ٹھنڈا کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ آگ اور پھوار کا یہ امتزاج اسے ایک نئی دنیا سے متعارف کرا رہا تھا۔ لاشعوری طور پر اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ وہ راستے کو غور سے دیکھتا جا رہا تھا۔ گاؤں، جو

اس کی منزل تھا، ابھی ڈھائی کلومیٹر دور تھا۔ سڑک کے طرف میں دیکھتا ہوا اچانک رُک گیا۔ یہ جگہ اس کی زندگی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ شاید آج وہ یہاں نہ ہوتا ، اگر بارہ سال قبل یہاں اسے یہاں روکا نہ گیا ہوتا۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور گاڑی سے اُتر آیا۔ چاروں طرف دیکھا۔ کچی سڑک نے سیاہ تارکول اوڑھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ چار اطراف ریت کے وہی ٹیلے، جھاڑیاں، بے آب وگیاہ زمین ..... جسے کبھی آزمایا ہی نہیں گیا تھا کہ وہ بنجر ہے یا شاداب فصلیں بھی دے سکتی ہے۔ کبھی کبھار بارش ہو جاتی تھی جس کا اظہار گھاس پھونس اور جھاڑیوں کی صورت میں ہو رہا تھا۔ وہ اس ببول کے درخت کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جسے اس کی چشمِ تصور نے سیکڑوں بار دیکھا تھا۔ وہ بغیر کسی کوشش کے نظر آ گیا۔ پہلے سے بوڑھا ہو گیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں بدلا۔" اس نے خودکلامی کے سے انداز میں کہا اور اس ببول کے درخت کی جانب بڑھ گیا جو اب وحشت سے اس کی جانب دیکھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ قریب گیا اور اس جگہ کو دیکھنے لگا جہاں اس کے اندر زندگی نے آنکھ کھولی تھی۔ وہ زندگی، جس نے اسے مردوں کی دنیا سے الگ کر دیا تھا۔ فہد وہیں کھڑا ان لمحات کو سوچنے لگا جس میں وقت کا فاصلہ تو تھا مگر اسے یوں لگ رہا تھا وہ ابھی تک وہیں ہے۔ درمیان میں جو وقت کا طویل دورانیہ ہے، وہ اسی خیال، اسی گیان کے مزید نکھر جانے میں بیت گیا۔ گاؤں کی جانب اٹھنے والے قدم ہی اس سفر کا آغاز ہوں گے۔ وہ ماضی اور حال کے اس لمحے میں آ گیا جہاں سب کچھ سمٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے اپنے سر کو

جھٹکا اور گاؤں کی سمت دیکھنے لگا۔ وہیں اس بستی میں ایک چہرہ ایسا بھی تھا جو اُسے آج تک نہیں بھولا تھا۔ وہ چہرہ اب نجانے کیسا ہوگا۔ اسے یاد تو تھا مگر وہ بارہ برس پہلے کا تھا۔ جوانی کے زینے پر پاؤں رکھنے والی بہار کی تاب کیسی ہوگی؟...... یہ تجسس من میں ہلکورے لے رہا تھا۔ اس نے ببول کے درخت سے نگاہ ہٹائی اور گاڑی میں آ بیٹھا۔ اسٹیئرنگ ویل پر دونوں ہاتھ رکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ ہمیشہ سے دل کو چھو لینے والا منظر چشم تصور میں آن سجا تھا۔

☆☆☆

اس دن وہ بڑا خوش تھا۔ اتنا کہ پندرہ برس کی عمر میں کبھی اتنا خوش نہیں ہوا تھا۔ اس دن اسے احساس ہوا تھا کہ کامیابی کی خوشی کیا ہوتی ہے؟ محنت کا ثمر کسے کہتے ہیں؟

ان دنوں وہ میٹرک کا امتحان پاس کر کے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ تو یہی سن رہا تھا کہ آج کل میں نتیجہ آ جائے گا۔ اسے اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کر کے آیا تھا۔ بیل گاڑی سے چارہ اتار کر اندر رکھ رہا تھا تو ماسٹر دین محمد تشریف لائے۔ سفید لٹھے کی شلوار قمیص، جس پر سیاہ رنگ کا کوٹ، سنہری کلے پر سواری کلف لگی پگڑی باندھے، ہاتھ میں چھڑی لیے وہ پھاٹک میں نمودار ہوئے تو وہ سارے کام چھوڑ کر ان کی جانب لپکا تھا۔ اس کے باپ نے بھی بڑھ کر سلام لیا اور انہیں لے کر صحن میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر آ بیٹھے۔ وہیں ایک کونے میں اس کی امی جان کھانا بنا رہی تھی۔ ماسٹر دین محمد کے لہجے میں پیار اُمڈ رہا تھا۔ اس نے فہد کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ تینوں ماسٹر دین محمد پاس آ بیٹھے تھے تو انہوں نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ بتایا، ”لو

بھائی فرزند حسین! آج میں تمہیں بہت بڑی خوش خبری دینے آیا ہوں۔ یہ اس اعتماد کا نتیجہ ہے جو تم نے آج سے پانچ سال پہلے مجھ پر اور فہد پر کیا تھا۔"

"مجھے یاد ہے کہ ماسٹر صاحب! میں نے فہد کو پانچویں جماعت کے بعد سکول سے اُٹھا لینا چاہا تھا۔ میں غریب آدمی اس کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ آپ ہی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔" فرزند حسین نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

"تم کوئی پہلے شخص نہیں تھے جو میرے پاس اس مقصد کیلئے آئے تھے۔ بہت سارے غریب والدین اپنے بچوں کو سکول سے اُٹھا لیتے ہیں۔ وہ آگے پڑھائی کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے یا پھر پیٹ پالنے کیلئے اپنے بچوں کو اپنے ساتھ کام پر لگا لیتے ہیں۔" ماسٹر دین محمد نے کہا۔

"میں بھی اس کے لیے گیا تھا۔ یہ تو آپ نے مہربانی کی کہ اس کا خرچ اپنے ذمہ لے لیا۔ مجھ پر بوجھ نہیں بنا اور اس نے دسویں کا امتحان دے دیا۔" فرزند حسین نے احسان مندی سے کہا۔

"تم نے بات مان کر اچھا کیا تھا ورنہ اکثر لوگ نہیں مانتے۔ پھر اس کی خوش قسمتی تھی کہ ساتھ والے گاؤں میں چوہدری ریاض کی کوشش سے ہائی سکول بن گیا اور میرا وہاں تبادلہ ہو گیا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ چوہدری ریاض کا بیٹا زمان شہر والے سکول میں پڑھ ہی نہیں سکا تھا۔ پھر چوہدرائن بھی اپنے اکلوتے بیٹے کو خود سے جدا نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے چوہدری نے کوشش کی۔ خیر وہ وقت گزر گیا۔ اب سنو! فہد نے ہمارے اعتماد کا پھل ہمیں کیا دیا ہے؟ سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔" ماسٹر دین

محمد بہ جذباتی ہو رہا تھا۔

"ایسا کیا کیا ہے میرے بیٹے نے؟" فرزند حسین نے رکتی سانس کے ساتھ پوچھا۔

"آپ کے فہد نے بورڈ میں پہلی پوزیشن لی ہے اور ہم سب کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔" ماسٹر دین محمد نے یوں کہا جیسے یہ اطلاع دیتے ہوئے وہ سرشار ہو رہا ہے۔

"ہائیں؟" فرزند حسین کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ خود فہد کو یقین نہ آیا۔ اس کی ماں نے روتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

پھر ماسٹر جی سے مخاطب ہو کر جذباتی لہجے میں بولی۔ "بھائی! میں نے تو ہمیشہ اپنے بیٹے کی کامیابی کیلئے دعائیں ہی کی تھیں۔ اس کے علاوہ میں اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ مبارکباد کے حقدار تو آپ ہیں۔ اپنے بیٹوں کی طرح رکھا اسے۔ اس کا صلہ تو ہم دے نہیں سکتے۔ پروردگار دے سکتا ہے اور میرا دل کہتا ہے کہ وہ ضرور دے گا۔"

"خیر مبارک میری بہن! میں سیدھا سکول سے ادھر ہی آ گیا ہوں۔ یہ بتانے کیلئے کہ ہمیں بورڈ کے دفتر جانا ہوگا۔ وہاں نتیجے کا باقاعدہ اعلان ہوگا اور پوزیشن لینے والوں کو انعامات دیے جائیں گے۔"

"جی! میں تیار رہوں گا۔" فہد جلدی سے بولا۔

"ہاں کپڑے ذرا اچھے اور دھلے ہوئے پہن لینا۔ وہاں بہت سارے لوگوں کے ساتھ ساتھ اخبار والے بھی ہوتے ہیں۔" ماسٹر دین محمد نے کہا۔

"جی! میرے پاس ایک نیا جوڑا ہے۔ عید پر سلوایا تھا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ میں مراد تانگے والے کو کہہ دوں گا۔ وہ ہمیں شہر تک لے جائے گا۔ آگے بس پر چلیں گے۔" یہ کہہ کر وہ فرزند حسین سے مخاطب ہوئے، "ویسے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی بہت خوش تھے کہ ہمارے سکول نے پوزیشن لی ہے۔ وہ بھی بورڈ میں جائیں گے۔" ماسٹر دین محمد نے اُٹھتے ہوئے کہا تو فہد نے پوچھا۔

"زمان کا کیا بنا استاد جی؟"

"بیٹا! اس کی قسمت۔ اس نے نقل لگائی تھی نا، ممکن ہے کہ فیل ہو گیا ہو۔ اب دیکھو کیسی بات ہے کہ جس کیلئے چوہدری ریاض نے سکول کو درجہ دلوایا، وہی فیل ہو گیا۔ خیر! یہ اپنی اپنی قسمت کی بات ہوتی ہے۔ اچھا جی! اب میں چلتا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر کی طرف چل دیے۔

دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ حلیمہ کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھیگ گئی تھیں۔ فہد نے ان چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ لیا اور سینے سے لگتے ہوئے بولا، "ماں! مت رو۔ یہ خوشی کا ویلا ہے۔"

"پتر! فکر نہ کر۔ یہ آنسو بھی خوشی کے ہیں۔ سنبھالے نہیں جاتے۔" ماں کے چہرے پر بارش اور دھوپ کا امتزاج بڑا مقدس تھا۔

چند لمحے اُسے تکتی رہی پھر اندر چلی گئی۔ فہد نے بیل گاڑی پر پڑا باقی چارہ اُٹھانے کیلئے کہا تو اُس کے باپ نے روک دیا۔ بڑے جذباتی لہجے میں بولا، "بس بھئی! آج سے تمہارا یہ کام دھندا ختم۔ تو اب صاحب بندہ بن گیا ہے۔ میں کر لوں گا یہ سب کچھ......"

وہ اپنے باپ کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

اسی شام وہ اپنے استاد کے گھر گیا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ سامنے صحن میں کھیلتی ہوئی سلمٰی نے جب اس کی طرف دیکھا تو فوراً لپک کر اس کی جانب آئی، "ہوئے فہد! سنا ہے تم نے پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ ہے ناں؟"

"ہاں تو! ......اور پتہ ہے کہ میں نے استاد جی کے ساتھ بورڈ میں بھی جانا ہے۔" فہد نے فخر سے کہا۔

"میں نے ابھی تک شہر نہیں دیکھا۔ میں بھی چلوں؟" سلمٰی نے دیدے گھمائے۔

"نہیں نہیں! وہاں بہت سارے لوگ ہوں گے۔ اگر تم گم ہو گئیں تو......؟" وہ تیزی سے بولا۔

"تم بھی تو میرے ساتھ ہوں گے نا! تم مجھے گم نہیں ہونے دینا۔" اس نے پھر معصومیت سے کہا۔

"ارے نہیں نا! تم بھی میری طرح پوزیشن لینا۔ پھر استاد جی تمہیں خود بورڈ میں لے کر جائیں گے۔ سمجھیں تم؟" اس نے سمجھایا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے فوراً مان گئی تھی۔

فہد علی الصباح اُٹھا اور عید والا جوڑا پہن کر تیار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے والدین سے مل کر اپنے گھر کے پھاٹک پر ہی آن کھڑا ہوا تھا۔ اس وقت سورج نکل رہا تھا جب ماسٹر دین محمد تانگے میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ مراد تانگہ چلا رہا تھا۔ اس دن ماسٹر دین محمد بھی خوب تیار ہو کر آئے تھے۔ فہد کے پائیدان پر پاؤں رکھتے ہی تانگہ چل پڑا۔ نور پیر کے وقت مراد اپنے انداز میں درود شریف پڑھتا جا رہا تھا۔ ماسٹر دین محمد کے ہاتھ

میں تشویش تھی۔ فہد دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ کچی سڑک پر چلتے ہوئے گاؤں سے کافی دور آ گئے۔ سورج نکل آیا اور روشنی پوری طرح پھیل گئی۔

"اللہ خیر کرے! یہ صبح صبح راستے میں چوہدری صاحب کی جیپ کیوں کھڑی ہے۔" مراد کی آواز پر ان دونوں نے بھی دور کھڑی جیپ کو دیکھا۔

"ہو سکتا ہے خراب ہو گئی ہو۔ تم ذرا احتیاط سے تانگہ نکال لینا۔ ذرا آہستہ بھی کر لینا اور دیکھنا کہیں دھول مٹی ان پر نہ پڑ جائے۔" ماسٹر دین محمد نے مراد کو سمجھایا۔

"آپ فکر نہ کریں جی!" مراد نے کہا۔ تانگہ اپنی مخصوص رفتار سے چلتا ہوا جیپ کے پاس پہنچ گیا۔ تبھی جیپ میں سے تین چار بندے نیچے اترے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں لاٹھی اور باقی دو خالی ہاتھ تھے جبکہ چوہدری ریاض بڑے تھمسے سے پسنجر سیٹ پر بیٹھا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ چند قدم آگے بڑھے اور ایک نے اونچی آواز میں کہا۔ "اوئے مرادے! تانگہ روک......"

للکار پر مرو نے فوراً ہی باگیں کھینچ لیں۔ رکتے رکتے تانگہ ان کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ ماسٹر دین محمد نے بھی انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "بات کیا ہے؟ تم لوگوں نے تانگہ کیوں رکوا لیا ہے؟"

اس نے بات سنی ان سنی کرتے ہوئے مراد کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "اوئے مرادے! یہ سواریاں شہر جا رہی ہیں؟"

"جی پہلوان جی!" وہ دھیرے سے بولا۔

"انہیں لے کر نہیں جانا۔ ہمیں جانا ہے، اتار دے انہیں۔" اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"انہیں بہت ضروری کام سے شہر جانا ہے۔" مرو نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"اصل بات بتاؤ پہلوان! تانگے کا راستہ کیوں روکا ہے تم نے؟" ماسٹر دین محمد نے جیپ میں بیٹھے چوہدری ریاض کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو سنو! تم اور تمہارا یہ شاگرد شہر نہیں جائیں گے۔ یہ چوہدری صاحب کا حکم ہے۔" اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"کیوں؟" ماسٹر جی نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تم اپنے ہیڈ ماسٹر سے پوچھتے رہنا۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

وہ فوراً سمجھ گیا۔ چوہدری ریاض کا بیٹا زمان نقل کرتے پکڑا گیا تھا۔ امتحانی عملے نے کوئی سفارش قبول نہ کرتے ہوئے اس کا پرچہ منسوخ کر دیا تھا۔ چوہدری نے ہیڈ ماسٹر کو حکم دیا کہ سارا معاملہ ٹھیک کرے اور زمان کو پاس کرائے۔ ہیڈ ماسٹر نے کافی کوشش کی لیکن اس کی دال نہ گل سکی۔ چوہدری نے بورڈ میں اپنا اثر و رسوخ آزما کر اسے پاس کرانے کی کوشش کی مگر بے سود رہا۔ چوہدری ریاض کو دکھ تھا کہ ہیڈ ماسٹر نے اس معاملے کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔

"اوہ! تو یہ بات ہے۔" ماسٹر دین محمد نے ساری بات سمجھتے ہوئے کہا، "بات سنو پہلوان! اپنے چوہدری صاحب سے کہو کہ اپنے بیٹے کے فیل ہو جانے کا غصہ اس بے

چارے غریب پر نہ اتارے۔"

"تمہارا ہیڈ ماسٹر ہو تم چاہتے تو نکا چوہدری پاس ہو جاتا۔" وہ غصے میں چوہدری کی زبان بولنے لگا۔

"وہ محنت کرتا تو یقیناً پاس ہو جاتا۔ مگر اس نے نقل لگائی اور پکڑا گیا۔ پھر جو ہوا، امتحانی عملے نے کیا، ہم قصوروار نہیں جبکہ اس بچے نے اپنی محنت ......"

ماسٹر دین محمد کی بات پہلوان نے کاٹ کر غصے سے کہا، "اب ہم جو کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں۔ اگر نکا چوہدری پاس نہیں ہوا تو سمجھو علاقے کا کوئی بھی لڑکا پاس نہیں ہوا۔ ہم تمہارے ہیڈ ماسٹر کو بھی ہم دیکھ لیں گے۔ خیریت اسی میں ہے کہ واپس چلا جا۔"

"میں چوہدری صاحب سے بات کرتا ہوں۔" ماسٹر دین محمد نے کہا اور تانگے سے اترنے لگا۔ وہ ابھی ٹھیک طرح سے اتر نہیں پائے تھے کہ پہلوان نے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور واپس موڑتے ہوئے کہا، "اوئے چل مرادے! بندے کا پتر بن اور واپس چل دے ورنہ تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دیں گے۔"

"اوئے پہلوان! جانے دو۔ میں بات کرنے جا رہا ہوں ناں ......" ماسٹر دین محمد نے کہا تو چوہدری ریاض غصے میں بولا، "اوئے پہلوان! اس ماسٹر سے کہو کہ میں کمی کمین لوگوں سے کلام نہیں کرتا۔"

اس کے یوں کہنے پر ماسٹر دین محمد چونک گیا اور فوراً اترا۔ چوہدری ریاض کے قریب جا کر بولا، "ہم کمی کمین ہی سہی چوہدری صاحب ......تم تانگہ رکوا لو گے تو کیا ہم

پیدل شہر نہیں جا سکیں گے؟ سیدھے طریقے سے کیوں نہیں کہتے ہو کہ کمی کمینوں کے غریب بچوں سے بھی جلنے لگے ہو۔ ہوش کرو چوہدری صاحب! ہوش کرو۔"

"ہوئے پہلوان! سنا نہیں تم نے ...... ان کا مکو ٹھپ دے تا کہ یہ پیدل بھی شہر نہ جا سکیں۔ ان کی تو ......" یہ کہتے ہوئے اس نے گالی دی۔

فہد اب تک خاموش بیٹھا ہوا تھا، بلبلا کر بولا، "چوہدری صاحب! میرے استاد کی شان میں گستاخی مت کرو۔"

اس کا اتنا ہی کہنا تھا کہ وہ گیم شیم پہلوان آگے بڑھا۔ اس نے تانگے میں بیٹھے ہوئے فہد کو پکڑ کر نیچے کھینچ لیا اور بے دردی سے مارنا شروع کر دیا۔ ماسٹر دین محمد نے چھڑانا چاہا تو اس کے ساتھی دیوانہ وار پل پڑے۔ فہد اپنی مار بھول کر استاد کو بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اپنے استاد کے اوپر لیٹ گیا۔ چاروں ان پر پل پڑے تھے۔ استاد کی پگڑی کہیں پڑی ہوئی تھی، کپڑے اور سر دھول میں اٹ گیا۔ فہد کا حال بھی دگرگوں تھا۔ اس نے آخری کوشش کرتے ہوئے ایک حملہ آور سے لاٹھی چھینی اور اس کے سر پر دے ماری جو ماسٹر جی کو ٹھڈے مار رہا تھا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ غضب ناک ہو گیا۔ اس نے فہد کو اٹھایا اور نیچے پٹخ دیا۔ پھر اٹھایا اور دور پھینک دیا۔ فہد ببول کے درخت کے پاس جا گرا۔ شدید درد کا احساس ہوا۔ سر پھٹ گیا تھا اور بہتے ہوئے خون سے اس کا چہرہ تر ہو گیا تھا۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے چاروں کو جیپ میں بیٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا۔

مراد تانگے والا بت بنا انہیں دیکھتا رہا۔ استاد دین محمد زمین پر بے حس و حرکت پڑا

ہوا تھا۔ فہد نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور پھر انہیں کھولنے کی بھرپور کوشش کی۔ اسی کشمکش میں اس کے اندر سے ایک ہوک اٹھی جس نے سوچ کا روپ دھار لیا کہ میں اس ظلم کو روکوں گا۔ اس نے پوری قوت سے اٹھنے کی کوشش کی اور لڑکھڑاتا ہوا ماسٹر جی کی جانب بڑھا۔ تب تک مراد بھی قریب آ گیا تھا۔ دونوں نے کوشش کر کے استاد دین محمد کو تانگے میں سوار کیا۔ پھر اسے بھی ہوش نہیں رہا کہ وہ کہاں ہے۔ جس وقت اسے ہوش آیا، اس پر ایک شخص جھکا ہوا تھا۔ اس نے فہد کی کھلی آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا۔ "اسے ہوش آ گیا ہے۔ گھبراؤ نہیں بیٹا! میں پروفیسر نذیر رازی ہوں۔"

فہد نے اسے ایک نظر دیکھا پھر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

نرم سی دھوپ کچے آنگن سے سمٹ کر اس کچی دیوار پر چڑھ گئی تھی جس کے ساتھ دری بچھائے بچے قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے قریب ہی کرسی ڈالے ملیحہ بیٹھی ہوئی تھی۔ سر پر بادامی رنگ کا آنچل جس میں سے سیاہ آوارہ لٹ جھول رہی تھی۔ جھکی جھکی پلکوں پر ستارے چمک رہے تھے۔ احمریں لبوں پر دھیمی سی مسکان تھی۔ الف ناک میں ہلکا سا لونگ تھا، چہرے پر الوہی کشش ایسی تھی جس میں ذرا سی آلودگی کا احساس بھی نہیں تھا۔ سرخ و سفید رنگت میں سے پاکیزگی کا احساس دیتا وہ چہرہ ایسا متناسب تھا کہ جو لوگ تناسب کو حسن گردانتے ہیں وہ بھی حیران رہ جائیں کہ ایسا حسن ہے جس نے تناسب کو بھی خوبصورتی عطا کر دی ہے۔ آنچل کے ہالے میں لانبی گردن کا احساس ہو رہا تھا اور پھر پورا بدن اسی آنچل سے ڈھکا ہوا۔ سیاہ رنگ کے

سلیپرز میں سے گورے پاؤں دمک رہے تھے۔ اگرچہ وہ اپنی جگہ تھمی ہوئی بیٹھی تھی لیکن لگتا یہی تھا کہ پورے آنگن میں وہی مرکز ہے۔ باقی سب کچھ اسی کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس سے ذرا فاصلے پر ماسٹر دین محمد دالان میں چارپائی پر پڑا تھا۔ وہ عینک لگائے کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا۔ سلمٰی پوری توجہ سے کچی پنسل سے تختی پر لکھ رہی تھی۔ ایسے میں سر اٹھا کر بھنورا آنکھوں سے مؤدبانہ کھڑے بچوں کو دیکھا۔ تختی تھما کر مسکراتے ہوئے بولی، "چلو بچو! اب تم چھٹی کرلو...... میں نے ابھی کھانا بنانا ہے۔"

"باجی! ہم ادھر کھیل لیں۔ گھر جاتے ہی امی کسی نہ کسی کام پر لگا دے گی۔" ایک بڑی بچی نے منہ بسورتے ہوئے اُسے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

وہ مسکرائی۔ "میں تمہیں کھیلنے تو دوں مگر تم لوگ شور بہت کرتے ہو۔ ابا جی تنگ ہوتے ہیں۔ اس لیے تم سب جاؤ، مجھے کام کرنے دو۔"

"میں آپ کے ساتھ کام کراؤں؟" سینے پر ہاتھ باندھے کھڑی کھلے کھلے چہرے والی بچی بولی۔

"نہیں ناں۔ جب میرے پاس اماں اماں ہیں تو پھر تم کیوں کرو کام۔ اب جاؤ اور اپنے گھر جا کر کھیلو۔" سلمٰی نے اس کی شرارت بھانپ کر پیار سے کہا اور پھر کچن کی جانب بڑھ گئی۔ چند قدم بڑھائے ہی تھے کہ باہر کار کا ہارن بجا۔ ایک بچہ باہر کی جانب نکلا۔ وہ متجسس سی کھڑی رہی۔ چند لمحوں ہی میں وہ بچہ واپس آ کر بولا "باہر ایک آدمی کار پر آیا ہے اور وہ ماسٹر دین محمد کا پوچھ رہا ہے۔"

"نام پوچھا؟"

"جی! فہد بتا رہا ہے۔" اس بچے نے کہا تو دل دھک سے رہ گیا۔ سانس جیسے سینے میں اٹک گئی اور پورے بدن میں بے عنوان سنسنی سی پھیل گئی۔

"کہہ رہا ہے کہ ماسٹر دین محمد گھر پر ہیں تو انہیں بتاؤ کہ میں آیا ہوں۔"

"فہد!" اس نے زیرِ لب کہا پھر اشتیاق بھری نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ بھاگ کر اس کے سواگت کیلئے جائے۔ دیکھے تو سہی ...... وہ کیسا ہو گیا ہے؟ کیا اُسے پہچانتا بھی ہے؟

"اُسے اندر بلاؤ بیٹی! مجھے یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا۔" ماسٹر دین محمد کی آواز پر وہ نہ صرف چونک گئی۔ حیرت بھی ہوئی۔ کیا کسی کی آمد کا اتنا بھی یقین ہوتا ہے؟ کیا اتنا یقین تھا کہ وہ کبھی پلٹ کر آئے گا اور کیا اس وقت دروازے پر آنے والا وہی فہد ہی تھا جس کے بارے میں وہ اتنے وثوق سے کہہ رہے تھے۔ وہ کوئی اور فہد بھی تو ہو سکتا تھا؟

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ماسٹر جی کبھی کبھی فہد کا ذکر کیا کرتے تھے لیکن انہوں نے یہ کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کرتا پھرتا ہے۔ وہ بھی بچپن کی یادوں کے حوالے سے اُسے یاد کر لیا کرتی تھی۔ وہ شرمایا شرمایا سا چھریرے بدن والا فہد جس نے میٹرک میں پہلی پوزیشن لی تھی اور ابھی تک گاؤں میں مثال کے طور پر یاد کیا جاتا تھا۔ وہ حیران تھی کہ بچپن کے چند دھندلے سے خاکے وقت کے ساتھ کیوں معدوم نہیں ہو پائے تھے جبکہ اُس نے بہت سی باتوں کو بھلا دیا تھا۔

اس نے دیکھا کبھی صحن میں آ جانے والے فہد نے آف وائٹ شلوار قمیص پر نیلے

رنگ کا ویسٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ گھنی مونچھیں تلے خوبصورت لب اور ذہانت ٹپکاتی آنکھیں..... وہ بہت بدل کر آیا تھا۔ اس کے خال وخد میں بچپن کی شبیہ جھلکتی تھی۔ وہ پروقار انداز میں چلتا ہوا ماسٹر دین محمد کی جانب بڑھا جو اٹھ کر بیٹھ چکے تھے۔ وہ جھکا اور ماسٹر جی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ کتنے ہی لمحے استاد شاگرد ایک دوسرے کو وارفتگی سے دیکھتے رہے۔ پھر ماسٹر جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پیار سے کاندھا تھپتھپا کر کہا،

"کیسے ہو پتر......؟"

ماسٹر دین محمد کے لہجے میں پیار اور آنکھوں میں اس کے بچپن کی تلاش مترشح تھی۔

"میں ٹھیک ہوں استاد جی! مگر لگتا ہے کہ ان گذرے ہوئے برسوں نے آپ سے بہت کچھ چھین لیا ہے۔" فہد نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا

ماسٹر جی نے فہد کا ہاتھ تھام لیا۔ "ہاں بہت کچھ چھین لیا ہے...... مگر ایک شے نہیں..... وہ میرا یقین تھا کہ تم لوٹ کر آؤ گے۔" ان کی آواز میں مضبوطی ان کے یقین کو ظاہر کر رہی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا، "میں آ گیا ہوں استاد جی!"

"اچھا کیا جو آگئے۔" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا، پھر قریب کھڑی بچی سے کہا۔ "جاؤ بیٹی لالاجی سے کہو۔ وہ پروہنے کیلئے چائے پانی کا بندوبست کرے۔"

"میں پانی پیئوں گا اور پھر کھانا کھاؤں گا۔ بہت بھوک لگی ہے" اس نے یوں کہا جیسے وہ اسی گھر کا فرد ہو۔ تبھی نیلی چونک گئی اور تیزی سے برتن نکالنے لگی۔ اس کا دھیان باہر سے آتی ہوئی آوازوں کی طرف تھا۔

"کب تک رہنے کا ارادہ ہے؟" ماسٹر دین محمد نے پوچھا۔

"میں اب یہیں رہوں گا۔" اس نے عزم سے کہا۔

"اوہ! بڑے مضبوط ارادے کے ساتھ آتے ہو۔" انہوں نے تجسس بھرے انداز میں کہا۔

"جی! ساری کشتیاں جلا کر آیا ہوں اور آپ کو معلوم ہے کہ کشتیاں کیوں جلائی جاتی ہیں؟" فہد نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"پروفیسر صاحب کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں وہ! اب لاہور میں ہیں۔ ان کے بچے وہیں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ ٹھیک ہی ہوں گے۔" اس کے لہجے میں یقین تھا۔

"وہ بھی تو آپ کی مانند میرے روحانی باپ ہیں۔ آپ نے مجھے بنیاد دی تھی، اس پر ساری عمارت انہوں نے ہی تعمیر کی۔" اس کے لہجے میں عقیدت شامل تھی۔

"ہاں! دراصل پروفیسر اور میں کالج تک کلاس فیلو رہے تھے۔ میں اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے نوکری کرنے پر مجبور ہو گیا اور وہ پڑھتا رہا۔ اور اس دن ......" یہ کہتے ہوئے ان کا گلا رندھ گیا۔ فہد نے جلدی سے ان کا ہاتھ تھام کر سہلانا شروع کر دیا۔ حوصلہ پا کر بولے، "میں نے تمہارے بارے میں اس سے بات کر لی تھی۔ اس نے اصرار کیا تھا کہ ایسے طالب علم کو اس کے پاس بھجوا دوں۔ میں نے بورڈ کی اس تقریب میں اسے بھی بلوایا تھا تا کہ تم سے ملاقات ہو جائے لیکن ......"

"استاد جی! اس کے بعد آپ سے ملاقات تو نہیں ہوئی مگر مجھے آپ کا نعم البدل مل

گیا۔ وہ میری راہنمائی کرتے گئے۔ پھر کبھی پوزیشن تو نہ لے سکا مگر چھتا رہا اور زندگی کو بڑے قریب سے دیکھتا رہا۔"

"کیسی ہے زندگی؟" انہوں نے دلچسپی لی۔

"زندگی نے مجھے سکھا دیا تھا کہ مرنے کے لیے زندہ ہونا بہت ضروری ہے۔ مردے میں تو پہلے ہی جان نہیں ہوتی، اسے موت کہاں سے آتی ہے اور میں زندہ ہوگیا۔ میں نے کالج میں اور پھر لاہور یونیورسٹی میں اپنا آپ منوا لیا۔ میر زادوں کی خواہشوں، خوابوں اور ارادوں سے کھیلا۔ سب مٹی سے کھیلنے کی چاہت رکھتے ہیں۔ میں ان سیاست دانوں کی نگاہ میں آگیا جو ہمارے جیسے لوگوں کو نرسری خیال کرتے ہیں۔ میں نرسری میں شامل ہوگیا۔ ان کا فائدہ ہونے لگا۔ میرے پاؤں جمتے گئے۔ میں نے گزارے لائق دولت بھی کمائی اور ادھر کا قصد کیا۔"

ماسٹر جی استفہامیہ نظروں سے اُسے دیکھتے رہے۔ وہ توقف کے بعد بولا، "کہا ناں! مرنے کیلئے زندگی تلاش کرتا رہا۔ اس دوران میں نے آپ سے بھی بے ایمانی کی......"

"میرے ساتھ......وہ کیا؟"

"میں نے اپنے آپ کو آپ سے چھپائے رکھا۔ لیکن میں آپ کو دیکھتا رہا۔"

"ہاں! تم جو رقم ہر ماہ بھیجا کرتے تھے، اُس سے میرا گھر کا نظام بہ آسانی چلتا رہا ہے۔ شاید میرا اپنا بیٹا ہوتا تو میرا اتنا خیال نہ کرتا۔" ان کی ممنون آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔

"تو کیا میں آپ کا اپنا بیٹا نہیں تھا؟...... نہیں ماسٹر جی! میں آپ کو اپنا باپ سمجھتا ہوں اور یہ میرا فرض تھا۔" اس نے محبت کی گرم جوشی میں کہا۔

"بھائی فرزند...... بہن حلیمہ......؟" انہوں نے پوچھا۔

"اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اماں فقط دو سال زندہ رہی تھیں؛ یہاں سے جا کر۔ مجھے ساری زندگی افسوس رہے گا کہ میں ان کی بیماری کا ٹھیک سے علاج نہ کروا سکا۔ انہیں گاؤں چھوڑنے کا، اپنی تذلیل کا اور حالات کا دکھ تھا۔ غم انہیں اندر ہی اندر گھن کی مانند کھا گئے۔ میرا باپ شہر میں مزدوری کرتا رہا۔ ماں کے بعد زیادہ عرصہ جی نہ سکا اور ایک دن سرکاری ہسپتال میں خالق حقیقی سے جا ملا۔ اور میں...... میں خود کو بد قسمت بھی نہیں کہہ سکتا۔" اس نے گلوگیر لہجے میں بتایا۔

"اور یہاں پر...... ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کے خلاف ایف آئی آر کٹوائی تھی جس کا غصہ مجھ پر نکالا۔ چوہدری ریاض اور اس کے کارندوں نے مجھے بہت تنگ کیا تھا۔ مویشی چوری ہو گئے...... کھیتوں کو آگ لگائی گئی...... وہ یہاں رہتے تو......" ماسٹر دین محمد کا لہجہ بھیگا تو آنکھوں سے آنسو لڑھک آئے۔

"نہیں، نہیں! استاد جی! اب نہیں رونا...... میں آ گیا ہوں نا......" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ تب انہوں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

سلمٰی کچن کی کھڑکی سے بھی غور سے دیکھ رہی تھی۔ ایک ایک لفظ اپنے تاثر کے ساتھ سن رہی تھی۔ ان کے درمیان موجود اتنے گہرے تعلق پر حیران ہو رہی تھی۔ اس

نے جلدی سے ٹرے میں گلاس رکھے، پاس کھڑی بچی کو تھمائی اور کھانا بنانے میں مصروف ہوگئی۔

اس کا دل قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اُسے فہد سے ملنے کی بے تابی تھی۔ کوئی روک ٹوک نہ ہوتے ہوئے بھی جرأت نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک ہاتھ دل پر رکھا، دوسری جانب آنکھوں پر، لب گیلے کرکے مسکرائی اور اپنے آپ سے کھیلنے لگی، الجھنے لگی۔

☆☆☆

"تو وہ چلا گیا۔" مارہ نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا اور تیز سانس لے کر پارک کے اس کونے کی جانب دیکھا جہاں بچے کھیل رہے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں میں آئے آنسو چھپانا چاہتی تھی جو بغاوت پر مائل تھے۔ چند لمحے خود پر قابو پاتی رہی پھر رندھی ہوئی آواز میں بولی، "جعفر! بتاؤ، میں نے ایسا کیا کیا تھا جس کی اُس نے مجھے سزا دی؟"

جعفر نے اس کی بات خاموشی سے سنی اور پھر اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ وہ سیاہ سوٹ، آف وائٹ شرٹ کے ساتھ گلے میں اسکارف پہنے ہوئے تھی۔ پہلی نگاہ میں وہ کوئی بزنس وومن دکھائی دیتی تھی حالانکہ اس کا بزنس کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ عالمی سطح کے ایک میگزین کی مقامی رپورٹر تھی اور مختلف چینلز کے لیے کام کرتی تھی۔

"میں کیا کہہ رہی ہوں؟" اس نے قدرے برہمی سے کہا۔

"اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ وہ یقیناً تمہاری محبت کے اہل نہیں تھا۔" وہ بولا۔

تب مارہ نے تیزی سے کہا، "تم...... جعفر یہ تم کہہ رہے ہو جو اس پر اپنی جان

مجھاور کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ میری بات چھوڑو...... تم بتاؤ تم اس کے لیے اتنے پرخلوص کیوں ہو؟"

"اس لیے کہ وہ میرا محسن ہے۔"

"جس سے فہد کا تعلق تھا، وہ یہی گمان کرتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ اسی کیئر خود ہے لیکن میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہارا اس سے جو تعلق تھا، وہ کسی سے بھی نہیں تھا، حتیٰ کہ میرے ساتھ بھی نہیں......" اس کا پارہ چڑھ رہا تھا۔

"تم کیا کیا چاہ رہی ہو؟" اس بار جعفر کے لہجے میں حیرت بھی تھی۔

"یہی کہ آخر ایسی کون سی مجبوری تھی جو اس نے یہاں کی پرسکون زندگی چھوڑ کر خود کو قتل گاہ میں جھونک دیا؟"

"تم صرف اپنے نکتہ نگاہ سے سوچتی ہو کہ وہ تمہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں تم سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا واقعی اسے تم سے محبت تھی؟" جعفر نے اُس پر نظریں مرتکز کر دیں۔

"میں نہیں جانتی کہ اس کے دل میں کیا تھا مگر میں اس سے محبت کرتی ہوں اور پھر اس نے بھی تو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا ہے۔"

"بس مائرہ! ہم اپنے اپنے دائروں میں رہ کر سوچتے ہیں۔ ہم اپنے ہی بنائے ہوئے معیار پر دوسروں کو پرکھتے ہیں۔ کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ دوسرے اپنے دائرے میں کیسی کیفیات رکھتے ہیں۔" اس نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

"لیکن ایسا بھی نہیں کہ دوسروں کا احساس نہ کر سکیں۔ تم جانتے ہو کہ میں ایک

دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ فہد نے کبھی اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت نہیں ہونے دیا کہ اسے دولت کا لالچ ہے۔ میں حیران ہوں کہ میرے والدین راضی ہیں اور وہ مجھے آسانی سے حاصل کر سکتا تھا۔ ایک شاندار......"

"مائرہ! تم نے تو فون پر کہا تھا کہ تم اپنا غم غلط کرنے کیلئے یہاں آنا چاہتی ہو۔" جعفر نے اسے ٹوکا۔ ایسا کر کے اس نے مائرہ کو مزید جذباتی نہیں ہونے دیا تھا۔

"ہاں جعفر! میں بہت ڈسٹرب ہوں۔ یہ دل اس کے نام پر دھڑکتا ہے نا۔ میں......" اس نے کہنا چاہا مگر جعفر نے پھر ٹوک دیا۔

"صرف اپنے لیے سوچ رہی ہو نا۔" اس نے کہا۔ "میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہ خود غرض محبت ہے جس میں فقط اپنے لیے سوچا جاتا ہے۔"

وہ خاموش رہی۔ جعفر نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "وہ جیسا بھی تھا، چلا گیا...... لیکن کیا اس کے چلے جانے کے بعد ہم اسے بھول جائیں گے۔ اسے اکیلا چھوڑ دیں گے۔ کیا اسے یہ احساس نہیں ہونے دیں گے کہ وہ جہاں بھی ہے، ہم اس کے ساتھ ہیں......؟"

"کیوں نہیں! میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ اسے کسی طرح واپس لایا جائے۔ وہ جس مجبوری میں بھی وہاں گیا ہے، دور کرنے میں مدد کی جائے۔ ظاہر ہے، اسے ہماری ضرورت تو ہوگی ہی۔" مائرہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"بس یہی اعتماد چاہیے۔" جعفر کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "وہ آئے گا...... ایک نہ ایک دن ضرور واپس آئے گا۔"

"ہاں! اسے آنا ہی ہوگا...... " مائرہ نے کہا اور آنے والے وقت کے حسین تصور میں کھو گئی۔ اپنا پرس اٹھاتے ہوئے بولی، "اٹھو! کہیں چل کر کافی پیتے ہیں۔"

"وائے ناٹ اینگری لیڈی......!" جعفر ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

"آپ کے لیے ناشتہ لاؤں؟"

"نہیں! میں نہانا چاہتا ہوں۔" فہد نے اسے بصد شوق دیکھا۔

"تو چلیں۔ پراٹھے ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"

"تو پرابلم! یہ تم مجھے آپ کیوں کہتی ہو۔ بھول گئیں ناں! پہلے بھی یوں اجنبیت سے تو نہیں بلایا کرتی تھیں ناں تم۔"

"تب اور بات تھی۔" اس نے آنکھیں چرائیں۔

"اب کیا بات ہے؟" اس نے فرار کی راہ مسدود کی۔

"اب آپ بڑے ہو گئے ہیں۔" وہ جھینپ کر بولی۔

"میرے ساتھ ساتھ تم بھی تو بڑی ہوگئی ہو۔" فہد نے بے ساختہ اس کی عمر کے نشیب و فراز کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"نہیں ناں! وہ والا بڑا نہیں...... میرے مطلب ہے کہ آپ بڑے آدمی بن گئے ہیں۔" وہ جلدی سے اپنی اصلاح کرتے ہوئے بولی۔

رات بھر دونوں استاد شاگرد ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ اب اس شعلہ جوالہ کو دیکھ رہا تھا جس نے دور رہ کر بھی اسے کبھی تنہا نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ

اپنے تصور سے بھی کہیں زیادہ خوب صورت اور معصوم تھی۔ فہد کو اتنی دلچسپی اور محویت سے دیکھتے پا کر گڑبڑا گئی۔ مستفسر ہوئی، "ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟"

"یہی کہ جب میں نے آخری بار تمہیں دیکھا تھا، تم اتنی سی تھیں۔" اس نے چارپائی کے پائے کی طرف اشارہ کیا، "شاید تیسری یا چوتھی جماعت میں پڑھ رہی تھیں۔ اب تمہیں دیکھنے کیلئے پورے بدن کی طاقت کو آنکھوں میں مجتمع کر کے داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔"

"ہاں شاید ...... مجھے تو یاد نہیں۔" وہ نہ سمجھتے ہوئے بے ساختگی سے بولی پھر اس کے جملے کی معنویت کو بھانپ کر ایک دم شرما گئی۔ دل اتنی زور سے دھڑکا کہ لگا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

"استاد جی بتا رہے تھے کہ تم نے بی اے کر لیا ہے۔" فہد نے اُسے مشکل سے نکالا۔

"جی! بلکہ میں نے تو بی ایڈ بھی کر لیا ہے۔ ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں ...... آپ بتائیں کیا ناشتہ لاؤں یا ......" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی صرف چائے لاؤ۔ میرے ہاتھ لینے تک ماسٹر جی بھی آ جائیں گے۔ ہم اکٹھے ناشتہ کریں گے۔" اس نے کہا ہی تھا کہ وہ فوراً پلٹ گئی۔

فہد جب بھی اپنے بچپن کو یاد کرتا یا اس حوالے سے کوئی بھی یاد ستاتی تو ایک نادیدہ آگ بھڑک جاتی تھی۔ زندگی کی تمام تر سنگلاخ مسافت میں نملی کا تصور اُسے ڈھارس دیا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ متجسس رہتی تھی کہ اب نجانے کیسی ہوگی۔ دیکھنے پر

پتہ چلا تھا کہ وہ جوان ہونے پر اس کی سوچوں سے بھی زیادہ خوبصورت ثابت ہوئی تھی۔

"یہ لیں......!" ملمی نے اس کے قریب چائے کا کپ رکھ دیا۔

"کیا میرا آنا تمہیں اچھا نہیں لگا؟" فہد نے غیر متوقع طور پر سوال کیا۔

"کک......کیا مطلب؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے؟" وہ گھبرا گئی۔

"یہ میں نے کب کہا؟" وہ چونکا۔

"پھر آپ نے ایسا کیوں سوچا؟" وہ حیرت سے بولی۔

"تم مجھ سے کتراتی ہو، اس لیے۔" وہ مسکرایا۔

وہ ساتھ پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی اور بولی، "اب ایسا نہیں کروں گی۔ کریں باتیں۔"

اس کے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے ہنس دیا۔ بولا، "تم بہت اچھی ہو۔"

"کیا اتنی سی بات پر آپ نے اتنی بڑی رائے قائم کر لی؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں! پھول کو دیکھ کر پہلی نظر میں ہی رائے قائم کر لی جاتی ہے۔" اس نے ارادی طور پر اپنی توجہ چائے کی اُڑتی ہوئی بھاپ پر مرکوز کر لی، خود کلامی کے سے انداز میں بولا، "میرے جانے کے بعد، میری وجہ سے ماسٹر جی کو بہت مشکل وقت گزارنا پڑا۔ بالواسطہ طور پر میں تمہاری زندگی پر بھی اثر انداز ہو گیا۔ مجھے افسوس ہے۔"

"ہمارا تو جیسے گزرا، سو گزر گیا، آپ کا وقت کیسا گزرا شہر میں؟"

"میرا وقت کیسے وقت گزرا؟" وہ دھیرے سے بولا، "ایک غریب دیہاتی

لڑکا جو اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیوشن پڑھاتا رہا ہو، اس کے شب وروز کیسے ہو سکتے ہیں، تم از خود اندازہ کر سکتی ہو۔"

"سنا ہے کہ آپ نے بہت کمایا ہے۔ میرے خیال میں اتنی دولت سیدھے طریقے سے نہیں آ سکتی۔ کہیں آپ غیر قانونی دھندہ تو نہیں کرتے؟" اس نے رات سے ذہن میں گھومتی چکراتی سوچ اس پر آشکار کر ڈالی۔

"غیر قانونی؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں بس چند لوگوں کی مجبوری بن گیا تھا جنہوں نے قوم کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹی ہے۔ یہ مہنگائی، غربت، کرپشن، بے حسی، کرائم، الغرض معاشرے کے سب بگاڑ ان کے پیدا کردہ ہیں۔ اگر ایک طرف نا انصافی ہے تو دوسری جانب مافیاز ہیں...... اس انصافی اور لوٹ مار میں وہ طبقہ بھی شامل ہے جو صرف تماشا دیکھ رہا ہے اور احتجاج نہیں کرتا۔"

"یہ جذباتی تقریر ہے، میرے سوال کا جواب تو نہیں۔"

اس پر فہد نے چونک کر ملیحہ کی طرف دیکھا۔ اسے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ عمومی دیہاتی لڑکیوں کے برعکس باتوں سے ٹلنے والی نہیں تھی۔

وہ مسکرایا، بولا، "میں نے لٹیروں کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھنے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ وہ خود کو شرفا کی قطار میں کھڑا رکھنے کیلئے میرا منہ بند رکھتے تھے۔"

"یعنی آپ انہیں بلیک میل کرتے تھے؟"

"بلیک میل نہ وائٹ میل، میں تو بس فیئر ڈیلنگ کرتا تھا۔ اسے تم معاہدہ بھی کہہ سکتی ہو۔" وہ انتہائی سنجیدگی سے بولا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" وہ الجھتے ہوئے بولی۔

"مجھے یہ بتاؤ، تلوار کے وار کو لاٹھی سے روکا جا سکتا ہے؟" اس نے پوچھا

"نہیں تو......" وہ بولی۔

"اسی طرح گولی کو ہتھیلی پر نہیں روکا جا سکتا۔ جنگ جیتنے کیلئے دشمن کے ہتھیار سے بڑا ہتھیار رکھنا پڑتا ہے۔ دو مالداروں کے درمیان غریب آدمی کیا کر سکتا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ جب تک دو مالدار ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہیں بنیں گے تب تک غریبوں کا فائدہ نہیں ہوتا۔ میں نے یہی راہ اپنائی۔ دو طاقتور حریفوں کے درمیان رابطہ بن گیا۔ دو ریوالور بردار لوگوں کے درمیان معاہدہ کروانے والا......لڑنے والا، نہ تماشا دیکھنے والا۔ یوں بے ایمانی اور رحم کے بغیر پیسہ کمایا۔"

"کیا فائدہ اتنی دولت اور اقتدار کمانے کا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ یہاں آ گئے ہیں۔" سلمٰی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں! یہ تم نے ٹھیک کہا۔" فہد نے چائے کا کپ اٹھایا، "زندگی کتنے نشیب و فراز سے گزرتی ہے لیکن ہم جیسے لوگ ایک دائرے میں ہی سفر کرتے رہتے ہیں۔ مسلسل چلتے رہنے کے باوجود ہم وہیں کھڑے رہتے ہیں۔ دوسری طرف ہر شعبۂ زندگی میں سہولیات کا سیلاب آ گیا۔ ترقی چاہے مادی ہے یا شعوری، انسان نے اس کا کتنا فائدہ اٹھایا۔ یہ سوال سارے اپنی جگہ مگر یہ حرکت، یہ تبدیلی دنیا کے چند خطوں تک ہی محدود کیوں ہے؟ یہ گاؤں کیوں نہیں بدلا؟ کیا اسے دیکھنے پر یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ جگہ ابھی پچھلی صدی کی پچھلی دہائی میں موجود ہے؟ جدید دنیا کے ثمرات یہاں تک کیوں

نہیں آئے؟ اور سب سے اہم سوال کہ ان کے آڑے کون ہے؟ میں پوچھتا ہوں یہاں اس گاؤں میں فون کی سہولت ہے؟"

"ہے تو سہی لیکن دوسرے گاؤں میں چوہدری کے ڈیرے پر ہے۔ جس کسی کو فون کرنا ہو، وہاں چلا جاتا ہے۔" نملی نے جواب دیا۔ تھوڑے توقف کے بعد بولی، "آپ کو یاد ہے، بچپن میں جب آپ یہاں آتے تھے تو میں ہی آپ کو چائے یا لسی دیا کرتی تھی۔"

"بچپن!" اس نے نملی کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد ہے...... سب یاد ہے تو میں یہاں ہوں۔ خیر! تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے؟"

"میں نے کیا سوچنا ہے؟" وہ چونکی۔

"مطلب کہ کوئی سوچ نہیں، یونہی زندگی......" وہ کہتے کہتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

"سوچتے وہ ہیں جن کے پاس کوئی امید یا کوئی آس ہوتی ہے۔ خواب بھی تبھی دیکھے جا سکتے ہیں نا۔ یہاں رہتے ہوئے زندگی گزار رہی ہوں۔ تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ تعلیم مکمل ہونے پر میری شادی ہو جائے گی یا پھر کسی سکول میں استانی بن کر پڑھانے لگوں گی اور بس!"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ خواب ہوں تو ان کی تعبیر کیلئے کوشش کی جاتی ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔ پرندے میں اڑنے کی فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ اسے اڑان

بھرنا سکھایا بھی جا سکتا ہے مگر جب اس کے پر ہی کٹے ہوئے ہوں، تب وہ کیسے اڑ سکتا ہے؟" نے جذباتی انداز میں کہا۔

"اڑنے کا شوق دل میں پیدا کرو، میں پرواز کرنا سکھا دوں گا۔" اس نے نیلمی کی آنکھوں میں براہ راست دیکھا۔

"آپ؟" اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں حیرت سے کہا۔

"ہاں میں...... کیا بچپن کی یادیں ہمارے ساتھ نہیں ہیں؟ کیا ان یادوں کی اوٹ سے کسی خواب نے نہیں جھانکا...... بولو نیلمی! کیا تمہاری زندگی میں میری ذات کا کوئی حوالہ نہیں ہے؟ ابھی تم نے سوال کیا تھا کہ میں یہاں کیوں آ گیا؟ کیا تمہارے دل نے تمہیں کوئی جواب نہیں دیا تھا؟"

"آپ کی آمد سے ہی سارے جواب مل گئے تھے۔ اب میں خواب دیکھا کروں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔

فہد اس کے چہرے پر سرشاری دیکھ چکا تھا۔ اس کے صحن میں چلے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا پھر غسل کیلئے اٹھ گیا۔ ماسٹر دین محمد آ گئے۔ وہ احتراماً کھڑا ہو گیا تو وہ بولے، "بیٹھو بیٹا!"

اس کے بیٹھنے پر بولے، "مسجد سے نکلتے ہوئے دیر ہو گئی۔ سبھی ساتھی تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ چھوٹا سا گاؤں ہے نا، سب کو تیری آمد کا پتہ چل گیا ہے۔ کئی لوگ تم سے ملنا بھی چاہتے ہیں......" یہ کہہ کر انہوں نے پوچھا، "ناشتہ کر لیا تم؟"

"نہیں! میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

"لوہا!" ان کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ پھر نلی کو آواز دے کر ناشتہ لانے کا کہا۔ پھر وہ لوگوں کے تجسس بھرے سوالوں کے بارے بتانے لگے۔

ناشتہ کے بعد وہ گھر سے نکل کر گاؤں کے مرکزی چوک میں آگیا جہاں مسجد کے سامنے ایستادہ پیپل کے درخت تلے چند بوڑھے اور نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ ساتھ میں دو دو کانیں تھیں جن کے آگے تھڑے پر اللہ دتہ موچی بیٹھا ہوا جوتے گانٹھ رہا تھا۔ وہ خاصا بوڑھا ہو گیا تھا۔ اس نے موٹے عدسوں والی عینک سفید رنگ کے دھاگے سے باندھ رکھی تھی۔ رنگ پہلے سے زیادہ سیاہ ہو گیا تھا جبکہ بدن بے حد لاغر۔ اس نے کار روکی اور اتر کر سیدھا اس کے پاس چلا گیا۔ "السلام علیکم چاچا اللہ دتہ......"

وہ تھڑے پر بیٹھ گیا۔ اللہ دتہ نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ چند لمحوں بعد اس کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق پیدا ہوگئی اور بے ساختہ بولا، "او ئے تو فہد چوہدری ہے نا؟ اپنے فرزند علی کا بیٹا؟"

"ہاں چاچا! تمہارے بیٹے الیاس کا کلاس فیلو فہد ہوں۔" اس نے بتایا تو اللہ دتے نے اپنا لرزتا ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے ہوئے پوچھا، "تو ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں چاچا! الیاس کہاں ہے؟" اس نے تیزی سے کہا۔

"وہ گھر پر ہی جوتے بناتا ہے۔" اللہ دتے نے اس کے سرخ و سفید چہرے کے عقب میں کھڑی کار کو دیکھتے ہوئے کہا، "اگر تو چاہے تو میں ادھر ہی بلوا دیتا ہوں۔"

"ہاں! یہی بہتر ہے۔ الیاس کے آنے تک ان سے مل لیتا ہوں۔" اس نے پیپل کے پیڑ تلے بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کیا جو اس کی طرف بڑی تجسس بھری

نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سب سے مل کر ان کے درمیان ہی بیٹھ گیا۔

"پتر! تو کتنا بڑا افسر لگ گیا ہے جو اتنی شاندار گاڑی، صاف ستھرے کپڑے اور اتنی اچھی صحت ہے، ماشاء اللہ!" ان میں سے ایک بزرگ نے سوال کیا۔

وہ خوش دلی سے ہنسا۔ بولا، "سچ پوچھو تو چاچا میں کوئی افسر نہیں ہوں۔ بس محنت مزدوری کرتا ہوں۔"

"مخول نہ کر یار...... محنت مزدوری ...... یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟" دوسرے نے حیرت سے کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ چل مجھے یہ بتا تیرے پتر یار کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ پر تو بتا یہ تو اچانک کہاں سے نکل آیا؟" ان کا تجسس کم نہیں ہو رہا تھا۔

"بس آ گیا ہوں چاچا! اب میں آپ لوگوں کے ساتھ رہوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"اوئے سچ؟ پر تو رہے گا کدھر؟ تمہارے گھر میں تو چوہدری نے ڈنگر باندھے ہوئے ہیں اور جو تیری چند ایکڑ زمین ہے، اس میں وہ چارہ اگاتا ہے۔"

"آ گیا ہوں تو گھر بار بھی چھڑا لوں گا۔" اس نے قدرے لاپروائی سے کہا۔

"مگر کیسے؟"

"لو چاچا! وہ خود چھوڑے گا سب کچھ۔ اس کی اوقات ہی کیا ہے؟"

"اوئے فہد! چوہدری کے خلاف بات نہ کر۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

ادھر منہ سے بات نکلے گی، اُدھر چوہدری کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔شاید تمہیں نہیں پتہ ......" ایک بندے نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

"پتہ ہے مجھے! کیا آپ لوگوں کو نہیں پتہ کہ دوسروں کے مال پر قبضہ کرنے والا چور، ڈاکو اور لٹیرا ہوتا ہے اور چوہدری لٹیروں سے بھی زیادہ غلط آدمی ہے جس نے لوگوں کے وسائل پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ میں چاہوں تو چند منٹوں میں یہ سب کچھ واپس لے لوں مگر میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کب تک مجھے خود واپس نہیں کرتا۔" فہد نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

اللہ دتے موچی نے اونچی آواز میں کہا "بات سوچ سمجھ کے کر پتر! اگر ہمت ہے تو سیدھے سیدھے قبضہ لے لے، ورنہ چپ رہ......"

"چاچا! کیا یہاں پر ہونے والی ہر بات چوہدری تک پہنچ جاتی ہے؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"ہاں! ہم میں سے ہی اسے اپنی وفاداری کیلئے سب کچھ جا کر بتاتے ہیں۔" اس نے انتہائی دکھ سے کہا۔

وہ بولا، "یہ وفاداری نہیں، غلامی ہے چاچا!"

یہ کہتے ہوئے اس نے اردگرد دیکھا، کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہی چھوٹا سا دروازہ، وہی ننگ دھڑنگ کھیلتے ہوئے بچے، وہی دھول مٹی سے اَٹی ہوئی گلیاں......

تبھی اس کی نگاہ الیاس پر پڑی۔ وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ الیاس کے چہرے پر پختگی آ گئی تھی مگر اس میں جوانی کا رس نہیں رہا تھا۔ میلی سی دھوتی، نیلی

قمیص اور پھول دار پرنا سر پر بندا ہوا تھا تجلسا ہوا چہرہ، چھوٹی سی داڑھی اور ہلکی مونچھیں۔ وہ دونوں چند لمحوں تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر بے تکلفی سے بغل گیر ہو گئے۔

"کل شام کا آیا ہوا ہے اور اب مل رہا ہے۔" الیاس نے شکوے بھرے لہجے میں کہا۔

"بس یار! استاد جی سے باتیں کرتا رہا۔ تو چل آ، بیٹھ گاڑی میں۔ باتیں بھی کرتے ہیں اور دوسروں کو تلاش بھی کرتے ہیں۔ تمہیں ہر ایک کا ٹھکانہ معلوم ہوگا۔" اس نے الیاس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ فہد کا انداز ایسا تھا جیسے اس نے اتنے برس کا طویل فاصلہ ایک چٹکی سے پکڑ کر اپنی زندگی سے باہر پھینک دیا ہو۔

سہ پہر ہونے تک اس نے اپنے پرانے کلاس فیلوز کو اکٹھا کر لیا جو اس گاؤں میں سے تھے۔ شاہد، گاما، بابر، مختار طاری، فضل ہادی، الیاس اور وہ...... اس وقت بھی سراج کے پاس ٹیوب ویل کے قریب کچے کھال پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب میں خوشی کی انہونی لہر کے ساتھ یہ تجسس بھی تھا کہ وہ اپنے بارے میں بتائے۔ تب اس نے اتنا کہہ کر جان چھڑوالی تھی۔

"یہ ایک لمبی داستان ہے اور یہ وقت نہیں کہ سناؤں۔ میں اب یہیں ہوں، ایک ایک بات بتاؤں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تو یہاں پر کہاں رہے گا؟" مختار طاری نے پوچھا جو ان میں

سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔

"میں سمجھ رہا ہوں کہ تو کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں اپنے گھر میں ہی رہوں گا۔" اس نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔

"وہ تو......" گامے نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

سراج بولا، "فہد! تم شاید نہیں جانتے ہو کہ چوہدری ریاض اسمبلی کا رکن ہے۔ تھانے کچہری میں اسی کی چلتی ہے۔ غنڈوں بدمعاشوں کی ایک فوج ہے اُس کے پاس، جن کے بل بوتے پر وہ اس سارے علاقے پر حکمرانی کر رہا ہے۔"

"بس تو دیکھتا رہ یار! کچھ نہ کچھ تو ہو گا ہی۔" فہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سراج کی آواز جذبات سے مغلوب تھی، "نہیں یار! چوہدری آسانی سے وہ جگہ خالی نہیں کرے گا۔ تو اگر اپنے پیروں پر مضبوط رہے گا تو کم از کم میں تمہارا ساتھ ضرور دوں گا۔ اپنے لیے تو لڑنا ہی پڑتا ہے ہاں! مگر جب دوسرے پر مصیبت آتی ہے تو سبھی خوف کھا جاتے ہیں۔ جب دوسرا ہی اپنے پیروں پر مضبوط نہ رہے تو لڑنے والا کیا کرے؟ مجھے چوہدری پر غصہ ہے لیکن کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ ہر بندہ خوفزدہ ہے۔"

"یہی تو ان لوگوں کو سمجھانا ہے۔ اصل میں یہ خوف ہی ان سب کو اکیلا ہونے کا احساس دے رہا ہے۔ انہیں یہ یقین نہیں کہ ایک ایک امنٹ مل کر دیوار بنا لیتی ہیں۔"

"تو پھر تو کیا کرے گا؟ یہ تو بتا۔" سراج نے پوچھا۔

"تو ابھی اپنا کام کر، شام کو کہیں ملتے ہیں۔ پھر بات ہو گی۔" فہد نے اُٹھتے ہوئے کہا تو وہ سارے اُٹھ گئے۔ فہد کو ان میں سے اپنے مطلب کے بندے مل گئے تھے۔

☆☆☆

چوہدری ریاض بڑے کروفر سے اپنے ڈیرے کے اندرونی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سفید رنگ کی شلوار قمیص اور اسی رنگ کی پگڑی پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں روایتی کھسہ تھا۔ خضاب لگی گھنی مونچھوں تلے موٹے ہونٹوں میں حقے کی نے دبی ہوئی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی علاقے کے ڈی ایس پی نے اُسے فون کیا تھا۔ اس کی باتوں نے چوہدری کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے فہد نامی کسی شخص کے بارے میں پوچھا تھا۔ ''نیازی صاحب! میں نے آج ہی سنا ہے کہ ساتھ والے گاؤں میں کوئی فہد نامی لڑکا ماسٹر دین محمد سے ملنے کیلئے آیا ہے۔ اس کے پاس بہت مہنگی کار ہے۔ لیکن آپ اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟ خیر تو ہے؟''

''میں اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے تو آگاہ نہیں ہوں پر یہ اندازہ ہے کہ وہ عام آدمی نہیں ہے۔ کچھ خاص لوگوں کا منظورِ نظر ہے جنہوں نے اس کے حوالے سے مجھے فون کیے ہیں۔''

''عام آدمی نہیں ہے؟ پر یہ مجھے کیوں بتایا جا رہا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ وہ کوئی جرائم پیشہ شخص ہے؟'' چوہدری کا ماتھا ٹھنکا۔

''نہیں ...... نہیں ...... معاملہ کچھ اور ہے۔ مجھے اوپر سے فون آیا ہے کہ کوئی فہد نامی شخص میرے علاقے میں آیا ہے۔ ممکن ہے اسے کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ ایسی حالت میں مجھے اس سے تعاون کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے، اسی علاقے

میں آپ موجود ہیں۔ آپ کا علاقہ ہے۔ اس لیے میں نے بہ طور احتیاط آپ کو صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔" ڈی ایس پی نیازی نے کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔ اور کوئی خدمت میرے لائق؟" چوہدری نے الوداعی انداز میں کہا۔

"نہیں ......بس یہی ......میں کسی وقت چکر لگاؤں گا۔ پھر اس سے بھی مل لوں گا۔" نیازی نے کہا اور رسمی گفتگو کے بعد فون بند کر دیا۔ یہ چند فقروں کا تبادلہ نہیں تھا بلکہ اس میں پنہاں وہ آگ تھی جسے فقط چوہدری ریاض ہی محسوس کر سکتا تھا۔ کسی اور کو اس کی حدت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے فہد اچھی طرح یاد تھا۔ بس وقت کی دھول پڑنے سے یادیں ذرا کمزور ہو گئی تھیں۔ وہ فہد کو ذرا بھر اہمیت نہ دیتا اگر نیازی اس پر عیاں نہ کر دیتا کہ فہد کے پیچھے بڑے لوگ تھے۔ وہ زمانہ شناس تھا۔ اس ٹیلی فون نے اُسے پریشان کر دیا تھا کیونکہ اس واقعے کے بعد سے اَب تک اُس نے ماسٹر دین محمد کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔

"لا جی! کوئی خاص بات ہے جو آپ یوں سوچ میں کھوئے ہوئے ہیں؟" اس کا بیٹا چوہدری زمان کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ وہ خوبرو جوان تھا۔ وضع قطع باپ جیسی تھی۔ آواز میں روایتی جاگیردارانہ کڑک موجود تھی۔

"نہیں! ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔" چوہدری نے حقہ کے کش پھیپھڑوں میں اُتارا۔

"کچھ تو ہے لا جی!" اس نے باپ کے چہرے کو بہ غور دیکھتے ہوئے کہا تو چوہدری

نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد نیازی سے ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو سنا دی۔

"وہ فہد! وہ کیا خاص شئے بن گئی ہے؟" زمان کے لہجے میں استعجاب کے ساتھ ساتھ استہزا کا عنصر شامل تھا۔

"پتہ نہیں! تم بہرحال اُس سے دور رہنا۔" زمانہ شناس چوہدری نے فکرمندانہ انداز میں کہا پھر اُٹھ کر ڈیرے پر آ گیا۔ یہاں کچھ لوگ اُس سے ملنے کیلئے بے تاب ہو رہے تھے۔ علاقے بھر سے آنے والے ملاقاتیوں کی بدولت اُسے عصر اور مغرب کا درمیانی وقت ڈیرے پر گزارنا ہوتا تھا۔ وہ لوگوں سے محوِ کلام تو تھا مگر ذہن مسلسل فہد کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ فہد کی گاؤں آمد بے سبب نہیں تھی۔ شہر میں جا بسنے والے کبھی گاؤں کا رُخ نہیں کرتے۔ پھر فہد کا تو یہاں کوئی بھی نہیں تھا جس کیلئے وہ شہر کی رنگینیاں اور رعنائیاں چھوڑ کر یہاں آ گیا تھا۔ مغرب سے ذرا پہلے کا وقت تھا جب مہا ڈیرے میں داخل ہوا۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ جھک کر سلام کرنے کے بعد ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"او ئے! خیر تو ہے ناں، کیا ہوا ہے تجھے؟" چوہدری نے اس کا سوجا ہوا منہ دیکھ کر پوچھا۔

"وہ جی فہد ہے ناں...... وہ جو ماسٹر دین محمد کے گھر آیا ہے۔ اس نے آ کر ڈنگر کھول دیے ہیں اور گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔" اس نے تیز تیز لہجے میں کہا۔

"ہوں...... تو یہ بات ہے!" چوہدری نے ہنکارا بھرا۔ وہاں موجود لوگوں کے چہروں پر سوال، استعجاب اور خوف ثبت ہو گیا۔

''اس کی یہ جرأت؟ میں ابھی دیکھتا ہوں۔ چل میرے ساتھ۔'' چوہدری زمان نے اُٹھتے ہوئے کہا تو چوہدری نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا۔ کہا، ''رک جاؤ! پہلے پوری بات معلوم کرنے دو۔'' یہ کہہ کر چوہدری نے موبے کی طرف دیکھا، ''تفصیل سے بتا، کیا ہوا ہے؟''

''وہ جی...... میں چارے کا کترا کر رہا تھا۔ باہر سے اُس نے پکارا۔ میں جب باہر آیا تو وہاں بہت سارے لوگ جمع تھے۔ اس نے مجھ سے کہا میں ڈنگر کھول کر لے جاؤں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس نے دو تین مرتبہ کہنے کے بعد خود ڈنگر کھولنے شروع کر دیے۔ مویشیوں کو اس نے کھلے پھاٹک سے باہر ہانک دیا۔ میں اتنی دیر میں اندر سے گن اُٹھا کر باہر آیا۔ اس نے مجھ سے گن چھین لی اور مجھے گن سے مارا پیٹا۔ میں نے بہت شور مچایا مگر گاؤں میں سے کسی نے مجھے چھڑانے یا میری مدد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ساتھ چند مزدور بھی تھے۔ انہوں نے میرا سامان باہر پھینک دیا۔ میں آپ کو بتانے کیلئے ادھر چلا آیا۔''

تفصیل سن کر چوہدری زمان پھنکارا، ''میں اس کی......''

''نہیں زمان! رک جاؤ۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اکیلا ہے۔ اکیلا بندہ اتنی بڑا اقدم نہیں اُٹھاتا۔ تم اندر چلو۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔'' چوہدری ریاض نے کہا اور اس کا بازو تھام کر اندر لے گیا۔ وہاں اکیلے میں بٹھا کر سمجھایا، ''دیکھ، تیل دیکھ، تیل کی دھار دیکھ۔ حالات پر غور کر، پھر وار کر......''

''آپ کو پتہ ہے کہ اس سے ہماری کتنی بے عزتی ہوئی۔ اسے روکنا ضروری

ہے۔" زمان نے برہمی سے کہا۔

"وہ جتنا بھی پھنے خان ہوگا، میں دیکھ لوں گا۔ حملہ آور کو یہی فوقیت ہوتی ہے کہ وہ حملے کیلئے تیار ہو کر آتا ہے۔ اس لیے غفلت کا فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ اس سے یہ وقتی فتح چھین لوں گا۔" چوہدری نے اپنے بیٹے کا شانہ تھپتھپایا اور کہا، "زمان! حیرت اس پر ہے کہ گاؤں کے سبھی لوگ خاموش تماشائی بنے کھڑے رہے اور موبے کو چھڑانے کیلئے بھی آگے نہیں بڑھے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ آج وہ تماشائی بنے ہیں۔ کل ہمارا تماشہ بنانے کیلئے نکل کھڑے ہوں گے۔ ہمارا دبدبہ ختم ہوتے ہی سر پر سوار ہو جائیں گے۔"

"ایسے نہیں ہوتا ہمارا دبدبہ ختم ...... وہو! تم اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھو۔ میں دیکھ لیتا ہوں۔" چوہدری ٹھہرا ٹھہرا بولا۔

صاف عیاں تھا کہ زمان نے دل سے اپنے باپ کی بات کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

چوہدری نے آرام سے کہا، "موبے کو واپس بھیج دو اور ہاں! نمبردار کو بلاؤ۔ اُسے ڈنگروں کا بندوبست کرنے کا حکم دے دو۔"

"ابا جی! نمبردار کیا کرے گا؟ زیادہ سے زیادہ فہد کو سمجھانے کی کوشش کرے گا۔ مگر وہ سمجھنے کیلئے گاؤں نہیں آیا۔ آج اس نے اپنا گھر لیا، کل اس نے زمین لے لی تو پورے علاقے میں ہماری ناک کٹ جائے گی۔" زمان کا پارہ پھر چڑھ گیا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ گھر اور زمین اسی کی ملکیت ہے۔ ہمارا قصوروار تو ہیڈ ماسٹر تھا۔ یہ ماسٹر دین محمد، فہد اور اس کے والدین تو یونہی سزا کاٹتے رہے۔ اب اتنے

برس بعد وہ اپنی جگہ واپس لے بھی لے تو کیا حرج ہے۔ ہمیں شور شرابہ نہیں کرنا چاہیے۔ اُس کی زمین بھی اُسے واپس دے دینی چاہیے۔" چوہدری ریاض نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا۔

"پر یہ طریقہ تو نہیں ہے نا..... وہ آتا ہمارے پاس، ہم اُسے واپس کرتے...... اس کی بدمعاشی قابلِ برداشت نہیں ہے۔" زمان اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

"بہت وقت پڑا ہے۔ بڑے معاملات سامنے آئیں گے۔ پہلے وہ اتنے برس یہاں سے دور رہا اب شاید ہمیشہ کیلئے جانا چاہتا ہے۔ کہہ رہا ہوں کہ دیکھتے جاؤ۔"

چوہدری کے لبوں پر سفاک مسکراہٹ ابھر آئی۔

"تو دیر کس بات کی ہے؟ ابھی معاملہ ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔"

"او نہیں او ئے! ہر معاملہ جلد بازی اور گولی سے حل نہیں ہوا کرتا۔ ہمارا ایک سیاسی پس منظر ہے۔ سیاست بہت کچھ کرا دیتی ہے۔ وہ وقت گزر گیا جب لوگ ڈانگ سوٹے سے ڈر جایا کرتے تھے۔ تم نے دیکھا تو ہے کہ ووٹ دیتے ہوئے سادہ لوح لوگ بھی کتنے چہرے دے جاتے ہیں۔ آنے والے وقت کے بارے سوچو۔ اس کے مطابق چلنے کی کوشش کرو۔ ساری زندگی میں نے ہی تو الیکشن نہیں لڑنا۔ تمہیں میدان میں ایک نہ ایک دن اُترنا ہے۔ تمہیں سو مرتبہ سمجھایا ہے کہ کھیل تماشوں کو چھوڑ دو۔ سنجیدگی سے سیاست کے داؤ پیچ سیکھو۔ آج وہی زمیندار کامیاب ہے جو سیاست کرتا ہے۔ لوگوں کو اپنی عقل سے باندھ کر رکھتا ہے۔" چوہدری نے دبی دبی مسکراہٹ میں بیٹے کو سمجھایا۔

"پر لاجی! اس کا حوصلہ تو دیکھیں۔ اکیلا....."

"یہی تو سوچنے اور تحمل سے دیکھنے کی بات ہے۔ ایسا اس نے کیوں کیا؟ ایسا حوصلہ اُسے کہاں سے ملا؟" چوہدری کی آنکھیں تردد اور فکر سے معمور ہوگئیں، "چھوڑ اس ذکر کو، چل جا! جب تک میں نہ کہوں، تو اس فہد کے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑائے گا۔ چل شاباش!"

چوہدری نے صوفے سے پشت ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

وقتِ عشا تک یہ اطلاع اسی گاؤں میں ہی نہیں، آس پاس کے علاقے میں بھی پھیل گئی کہ فہد نے چوہدری ریاض سے اپنا گھر واگزار کرالیا ہے۔ جو بھی سنتا، انگشت بدنداں ہو جاتا۔ سورج ڈھل جانے کے بعد یہی واقعہ ہر صحن میں موضوعِ گفتگو تھا۔ کوئی اس کے حوصلے کی داد دے رہا تھا، کچھ اس خوف میں مبتلا تھے کہ اب کیا ہوگا اور کسی کو فہد کی جوانی بھاری تھی۔

ایسے میں ماسٹر دین محمد بھی اپنی چارپائی پر پڑا سوچ رہا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ فہد یوں اچانک وار کرے گا اور مارِ خوابیدہ کی دم پر پاؤں رکھ دے گا۔ اُسے آنے والے دن بڑے خطرناک دکھائی دینے لگے۔ اس نے ہنکارا بھرا۔ صحن کی جانب دیکھا جہاں سلمیٰ کھانا بنا رہی تھی۔

سلمیٰ اپنے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے بظاہر چولہے میں جلتی ہوئی آگ کو دیکھ رہی تھی لیکن اس کا سارا دھیان فہد کی طرف تھا۔ فہد کے کارنامے کی اطلاع نے اُسے متفکر کر

دیا تھا۔ تب آنچ کی لو اور جلتے چولہے کی روشنی میں اس کا چہرہ سنہرا لگ رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ من میں لرزش اسے بے چین کیے دے رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ برسوں بعد ملنے والے فہد کو شاید وہ اب کھو دے گی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ وہ سبھی خطرات کو ذہن میں رکھ کر پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا ارادہ لے کر یہاں آیا تھا۔

اس صبح سے پیشتر تو اس کے ذہن میں بچپن کی چند یادیں تھیں۔ لیکن صبح اچانک ملنے والی آگہی سے وہ کس قدر خوش ہوئی تھی۔ تب اس نے نجانے کتنے رنگین خواب پلکوں پر رکھ چھوڑے تھے۔ پورا دن خمار میں بیت گیا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ لفظ بھی اتنی قوت رکھتے ہیں کہ بندے کو سرشار کر دیں۔ اس کی پرسکون جھیل جیسی زندگی میں انجانی لہریں ابھری تھیں جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ وہ لہروں کی مانند اس کائنات میں خود کو پھیلتا ہوا محسوس کرنے لگی۔ فہد کا لہجہ، لفظ اور دیکھنے کا انداز جسم تصور پر ثبت تھا۔ مگر کیا ہوا کہ ڈھلتی شام کے ساتھ ہی اس کے سارے خواب ٹوٹنے لگے تھے۔ کیا خوابوں کی عمری اتنی مختصر ہوتی ہے؟ خمار ٹوٹ کر شکست کا احساس تھکن بنا کر رگ وپے میں اتر رہا تھا۔ کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ اسے فہد پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ آیا ہی کیوں تھا؟ اسے بچپن کی بے ضرر یادوں کے سہارے رہنے دیا ہوتا۔ ایسی اذیت میں تو مبتلا نہ کرتا جو اس کی زندگی میں زہر کی مانند پھیل جائے۔ خواب دیکھنا اس قدر اذیت ناک بھی ہوتا ہے، ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ ان لمحات میں ایک نئے تجربے سے گزر رہی تھی۔ اگر من میں آگ لگی ہو تو باہر کی حدت متاثر نہیں کرتی

کیونکہ۔ چولہے میں بھڑکتی ہوئی آگ کی حدت اسے خیالوں کی دنیا سے نکال نہیں پائی تھی۔

دروازے پر کار رکنے کی آواز سن کر چونک گئی۔ دستک سنائی دی پھر فہد کے قدموں کی چاپ۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا۔ فہد کو ابو کے پاس کھڑے دیکھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے پوچھا، "فہد بیٹا! یہ میں نے کیا سنا ہے تمہارے بارے؟"

"بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ میں نے اپنا گھر واپس لے لیا ہے۔" فہد کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولا۔

ماسٹر دین محمد کی آواز لرزی، "بیٹا! وہ بہت ظالم لوگ ہیں۔"

"تو کیا ہوا استاد جی! دنیا کفر کے ساتھ تو رہ سکتی ہے مگر ظلم کے ساتھ نہیں۔ آپ یقین رکھیں۔ جتنا ظلم انہوں نے کرنا تھا، کر لیا۔ اب ان کا اٹھنے والا ہاتھ سلامت نہیں رہے گا۔" فہد کا لہجہ پرسکون تھا۔

"تم اکیلے ...... میرا مطلب ہے کہ مقابلہ تو قوت کا قوت کے ساتھ ہوتا ہے ناں۔ وہ کسی بھی وقت تمہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میں بوڑھا بندہ ہوں۔ ڈانگ سوٹا تو اٹھا بھی نہیں سکتا۔ پھر تمہارا ساتھ کیسے دے سکوں گا۔"

"بے شک آپ درست کہتے ہیں لیکن میں نے کہا ناں! آپ یقین رکھیں کہ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے ڈانگ سوٹے کی نہیں، آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے یوں لگتا ہے بیٹا! جیسے تم ان کے بارے میں اچھی طرح جانتے نہیں ہو۔

خیر! میرے بوڑھے اور لاغر وجود کا خیال کرو۔ میں نے بہت سزا کاٹی ہے اور اب ......" یہ کہتے ہوئے ماسٹر دین محمد کا گلا رندھ گیا۔ تب فہد نے ان کے پیروں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "استاد جی! آپ میرا حوصلہ ہیں۔ ایک آپ ہی تو ہیں اس دنیا میں میرا آسرا ہیں۔ مجھے حوصلہ دیں۔" فہد نے حد درجہ جذباتی ہو کر کہا تو ماسٹر دین محمد چند لمحوں تک اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر دھیرے سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ سلمیٰ دونوں کو دیکھتی رہی مگر کوئی فیصلہ نہ کر پائی کہ ایسا ہونا چاہیے تھا یا نہیں۔

اس وقت وہ دونوں کھانا کھا چکے تھے۔ سلمیٰ برتن سمیٹ کر کچن میں جا چکی تھی۔ جب دروازے پر تیز دستک ہوئی، فہد اٹھ کر باہر جانے لگا تو ماسٹر دین محمد نے روک دیا۔ "تم بیٹھو بیٹا! میں دیکھتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد اس کے ساتھ گاؤں کا نمبردار اندر آیا۔ وہ چھریرے بدن کا چھوٹے قد والا شخص تھا۔ اس نے بڑی سی پگڑی، قمیص اور تہبند باندھی ہوئی تھی۔ وہ آ کر بڑے غصے سے بیٹھ گیا اور فہد کی طرف دیکھ کر بولا۔ "آپ کے پاس آئے ہوئے مہمان نے جو حرکت کی ہے، وہ سراسر غلط ہے۔ اس کا احساس ہے آپ کو ماسٹر جی؟ ...... ہم گاؤں والے جو آپ کی اتنی عزت کرتے ہیں، اس کا یہ صلہ دیا ہے آپ نے۔ جانتے ہیں کہ اس سے چوہدری صاحب کس قدر ناراض ہیں۔ انہوں نے خصوصی طور پر مجھے بلا کر آپ کے پاس بھیجا ہے تا کہ میں آپ کو سمجھاؤں۔"

"کیا تم اپنی بات کہہ چکے ہو؟" فہد نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"ہاں!" اس نے فہد کی جانب دانستہ طور پر دیکھے بغیر پھنکار ابھرا۔

"تو پھر سنو! میں اس گاؤں میں ماسٹر صاحب سمیت کسی کا مہمان نہیں ہوں۔ یہ میرا گاؤں ہے اور اس گاؤں میں میرا اپنا گھر ہے جسے میں نے خالی کروالیا ہے۔ میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔ ہاں! تم اور تمہارے چوہدری نے اب تک جو کیا تھا، وہ غلط تھا۔ اس کا جواب دہ کون ہے؟ تم یا تمہارا چوہدری؟...... تم لوگوں نے اگر ماسٹر جی کی عزت کی ہوتی تو آج یہ اس حال کو نہ پہنچتے۔ مجھے چوہدری کے ناراض ہونے یا نہ ہونے کی کوئی پروا نہیں۔ اور آج کے بعد میرے کسی بھی معاملے میں استاد محترم کے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ براہ راست مجھ سے بات کی جائے۔ سمجھے تم؟" فہد کا لہجہ بتدریج تلخ ہوتا گیا۔

"لڑکے! تم چوہدری کی طاقت کو نہیں جانتے ہو۔ وہ تمہیں چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دے گا۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ مجھے بات کرنے کیلئے یہاں بھیج دیا۔" نمبردار نے تنبیہ کی۔

"اور تم ہمیں دھمکانے کیلئے آگئے ہو۔" فہد نے طنز بھرے انداز میں کہا۔

"دھمکانے نہیں، حقیقت بتانے آیا ہوں۔ کیا اس طرح غنڈہ گردی کرتے ہیں۔ تم ان کے پاس جاتے، منت سماجت کرکے اپنا گھر واپس لے لیتے۔ وہ تمہیں تمہارا حق دے دیتے۔ انہوں نے تو اتنے برس تمہارے گھر اور زمین کی حفاظت کی ہے۔ تم اس احسان کا بدلہ یہ دے رہے ہو کہ ان کے ساتھ لڑنے جھگڑنے پر کمربستہ ہوگئے ہو۔ شکر کرو کہ انہوں نے تمہاری نادانی کو نظر انداز کرکے مجھے بلا بھیجا۔" نمبردار کی آنکھیں شعلے اگلنے لگیں۔

"نمبردار! تم آنکھوں والے اندھے ہو۔ تم سے بات کرنا فضول ہے۔ گھر تو میں نے لے ہی لیا۔ اب زمین وہ خود دے گا مجھے۔ یہ بات اُسے جا کر بتا دو کہ جس طرح میں نے گھر لیا ہے، اسی طرح زمین بھی لے سکتا ہوں۔"

"لگتا ہے کہ تمہارے سر پر خون سوار ہو گیا ہے۔ اس بوڑھے......"

"خبردار! آگے ایک لفظ بھی کہا تو...... کہا ہے ناں کہ یہ میرے استاد محترم ہیں۔ ان سے تمیز سے بات کرو۔ یقین مانو! میں خون خرابے کے حق میں نہیں ہوں ورنہ تمہارا چوہدری یہ علاقہ چھوڑ کر بھاگ گیا ہوتا۔ میں کسی کا حق نہیں، اپنا حق لینا چاہتا ہوں۔ تمہارے چوہدری نے اگر طاقت دکھانے کی کوشش کی تو اس کا بھرپور جواب دوں گا۔ بتا دینا اُسے......" فہد نے غصے میں کہا تو نمبردار اُسے خشمگیں نگاہوں سے گھور کر خاموش ہو گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اسے یوں کھرا جواب ملے گا۔ دونوں کے بیچ کچھ دیر خاموشی حائل رہی پھر فہد نے کہا۔ "اصل میں تمہارے جیسے خوشامدی لوگ اپنے مفاد کیلئے چوہدری جیسے لوگوں کو ظلم کی دعوت دیتے ہیں۔ جب میرے باپ کو بے سرو سامانی کی حالت میں یہاں سے نکالا گیا تھا تب تم کہاں تھے؟ یہیں تھے ناں؟ تم نے میرے باپ کی مدد کی؟...... کیا اُس نے میرے گھر اور زمین کی حفاظت کی غرض سے میرے باپ کو بے دخل کیا تھا؟...... میں نادان نہیں ہوں۔ جاؤ اور جا کر اُسے کہہ دو۔ ماسٹر دین محمد کی جتنی جنگ اُس نے کرنی تھی، کر لی۔ اب میں یہاں ہوں۔ میرے بارے میں سوچے تو ذرا دھیان سے سوچے۔ اب تم بھی چلتے نظر آؤ۔"

"ماسٹر! یہ لڑکا بڑا جذباتی ہو رہا ہے۔ اپنے ساتھ تمہاری عزت بھی مٹی میں

رول دے گا۔" نمبردار کی آواز میں سانپ کی سی پھنکار شامل تھی۔

"یہ لڑکا جو کہہ رہا ہے، ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب تم جاؤ۔" ماسٹر دین محمد کی آواز میں واضح طور پر لرزش تھی۔

نمبردار نے تاسف اور ہمدردی آمیز انداز میں چوہدری کو دیکھا اور مزید کوئی دھمکی دیے بغیر بیرونی دروازے کا رخ کیا۔

سلمیٰ باورچی خانے کے دروازے سے لگی ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی دانست میں فہد پاگل پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اسے شاید یہاں کے ماحول کا اندازہ نہیں تھا۔ فقط گھر خالی کروا لینے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اب خطرہ ہمیشہ کیلئے ٹل گیا تھا یا چوہدری نے شکست تسلیم کر لی تھی۔ خطرات کی شروعات ہوئی تھیں۔ خوف کے سائے پھیل گئے۔ سلمیٰ کے ذہن میں وہ بھی باتیں گھومنے لگیں جو چوہدری ریاض کے مظالم کے بارے لوگوں سے سن رکھی تھیں۔ خوف بھی عجب شے ہے۔ ایک بار انسانی ذہن کو اپنی لپیٹ میں لے لے تو یقین پر مسلسل ضربیں لگنے لگتی ہیں۔ وہ کانپ کر رہ گئی۔

اس نے دیکھا۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھے اور فہد کو سمجھائے۔ اسے خبردار کرے کہ جنگ جیتنے کی خواہش اس وقت کی جاتی ہے جب طاقتوں میں توازن ہو۔ وہ کچھ کہنے کی ہمت نہ کر پائی۔ فہد کی آواز کانوں میں پڑی۔

"اچھا استاد جی! میں چلتا ہوں۔ رات اپنے گھر میں گزاروں گا۔"

"دیکھنا بیٹا! دشمن سے غافل نہ ہو جانا۔"

ماسٹر جی کی اندیشے سے سرسراتی ہوئی آواز نے سلمیٰ کو چونکا دیا۔ اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ فہد کو روک لے، سمجھائے اور باہر والے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ فہد نے وہیں سے گزر کر باہر جانا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ وہاں سے گزرا تو سلمیٰ نے بلا جھجک اس کا بازو تھام لیا۔ اندر لے گئی۔ فہد اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا کمرے تک چلا آیا۔ سلمیٰ کی آنکھوں سے مترشح خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر بولا۔ ''کیا ہوا تمہیں؟''

''آپ کو احساس ہے کہ آپ کتنی خطرناک صورت حال سے دوچار ہیں؟'' اس کی آواز کے ساتھ اس کی گرفت بھی کانپنے لگی۔

''اوہ! تو یہ بات ہے۔!'' فہد نے نہایت آہستگی سے اپنا بازو چھڑا لیا اور اس کے شانوں کو تھام کر بولا۔ ''کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں اس آگ میں کودنے سے پہلے بہت کچھ سوچ چکا ہوں۔''

''آپ کو شاید......'' اس نے کہنا چاہا مگر کہہ نہ پائی۔ فہد کی آنکھوں نے اس کی زبان تھام لی۔

بولا۔ ''سلمیٰ! میں اس کی فرعونیت سے آگاہ ہوں۔ کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ کیا ہو سکتا ہے، کیا ہونے والا ہے، سب پر نگاہ رکھتا ہوں۔ تم گھبرانے کے بجائے مجھے یقین دو کہ میرا حوصلہ بلند رکھنے والے میرے اپنے گاؤں میں موجود ہیں۔''

اس کے لہجے اور لفظوں میں کوئی ایسی تاثیر تھی کہ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ جو نگاہیں خوف زدہ ہرنی کی مانند تھیں، ان میں اترتی ہوئی حیا کے ساتھ نجانے کتنے سوال

سمت کر اپنا اظہار کرنے لگے۔ تھر تھراتا ہوا وجود ایک دم ساکت ہو گیا۔

توقف کے بعد سنسناتے ہوئی آواز میں مستفسر ہوئی، ''کون اپنے؟''

''تم!'' فہد نے ایک ذرا مسکرا کر کہا، ''اور کون؟''

''کیا کہا آپ نے؟ میں ......؟'' وہ اٹکنے لگی۔

''ہاں سلمیٰ! تم میری اپنی ہو۔ کیا بچپن کی یادیں فقط تمہیں یاد ہیں؟ مجھے نہیں؟ ...... نہیں ...... میں کچھ بھی تو نہیں بھول سکا ہوں آج تک۔ جہاں خود پر ٹوٹنے والی قیامتیں یاد ہیں مجھے: وہاں میں ان لمحوں کو بھی سینے سے لگائے پھرتا ہوں جو تمہارے قرب میں گزرے تھے۔''

''کیا؟'' وہ حیرت سے کچھ پوچھنے لگی، رُک گئی اور جھینپ گئی: یوں کہ کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

''سچ سلمیٰ! مجھے میرے اندر بھڑکتی ہوئی آگ ہی نے زندہ نہیں رکھا، محبت کی خوشبو نے مجھے زندہ رہنے کا جواز بھی بخشا ہے۔ میرے بچپن کی کچی محبت ...... اب اس قدر پختہ ہو گئی ہے کہ مجھے خود بھی ٹوٹنے نہیں دیتی۔ تم میری محبت ہی نہیں، میرا حوصلہ بھی ہو۔ اگر تم ہی ......''

''فہد! ان چند لمحوں سے پہلے تو میں فقط خوفزدہ تھی مگر اب تو مجھے اپنی زندگی بھی خطرے میں محسوس ہو رہی ہے۔'' اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا جس میں اپنائیت جھلک رہی تھی۔

''کیا یہ میری زندگی میری نہیں ہے؟ میں نہیں جانتا کہ تم نے کیسے خواب دیکھے

ہوں گے۔ میں تو اپنے خوابوں کے بارے میں خوب جانتا ہوں۔ محبت بھرے خوابوں میں جس جنت کا تصور میرے ذہن میں ہے، وہ یونہی نہیں مل جانے والی۔ اس کے درمیان آگ کا دریا حائل ہے۔ جس کے پار اتر کر ہی اپنے خوابوں کی سرزمین پر بسا جا سکتا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تلمی تمہارے دل میں میرے لیے محبت ہے بھی یا نہیں، مگر میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ سمجھ لو! تمہاری خوشی میری محبت کی معراج ہے۔" فہد نے دھیرے دھیرے سے کہا۔

"فہد! مجھے اعتراف ہے کہ میں نے بھی تمہارے خواب دیکھے ہیں۔ مگر میرے خوابوں کی جنت میں کہیں بھی خون خرابہ یا آگ کا دریا نہیں ہے۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ ہم یہاں سے کہیں اور بھی جا سکتے ہیں۔ ایسی جگہ جہاں ......" وہ اپنی دنیا میں کھو کر بول رہی تھی مگر فہد نے ٹوک دیا۔

کہا، "میں تمہیں نہیں سمجھا سکتا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ مجھے یقین چاہیے۔ مجھ پر یقین......"

"اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں خوش رہ پاؤں گی؟ ان چند لمحوں سے پہلے میری دنیا بہت محدود تھی۔ لیکن اب یہ آپ کی ذات کو بھی سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک عورت کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوتی ہے؟"

اس نے کہا، "ہاں مجھے احساس ہے...... مجھ پر بھروسہ رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

سانسوں کا لمس محسوس کر کے وہ ایک دم سے سمٹ گئی تھی۔

فہد نے اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا، "میں چلتا ہوں۔"

وہ چلا گیا تھا۔ نملی ساکت کھڑی رہی۔ کار کے سٹارٹ ہونے کی آواز ابھری اور پھر معدوم ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ فہد اپنے اسی گھر میں موجود تھا جہاں برسوں پہلے رہتا تھا۔ ان درودیوار میں اس کی بچپن کی یادیں روشن تھیں۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کے پاس سوائے سراج اور الیاس کے کوئی کلاس فیلو نہیں آیا تھا۔ سراج اپنے ساتھ کافی ساری کھانے پینے کی چیزیں لایا تھا۔ ان کے درمیان یونہی باتیں چلتی رہیں۔

"یار! لاہور میں تم نے اتنا کچھ بنایا جسے چھوڑ کر تم یہاں آ گئے؟" سراج نے پوچھا۔

"ہاں یار! میں نے چوہدری سے انتقام ہی لینا ہوتا نا تو وہاں بیٹھ کر بڑے اچھے طریقے سے لے سکتا تھا۔ ممکن ہے تمہیں میری یہ بات یونہی سی لگے مگر آئندہ آنے والے دنوں میں تمہیں یقین آ جائے گا کہ یہاں تبدیلی چاہتا ہوں۔" وہ دھیرے سے بولا

"مگر میرا سوال اپنی جگہ موجود ہے۔"

"میں یہاں پر مٹی کا قرض ادا کرنے آیا ہوں۔ یہ کیسے ہوگا، میں ابھی خود نہیں جانتا۔ مگر میں فرعونیت کا راج توڑنا چاہتا ہوں۔ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں، اس کے لیے مجھے تم جیسے دلیر لوگوں کی ضرورت ہے، کیا تم نہیں چاہتے ہو کہ چوہدری نے جو

یہاں خوف طاری کیا ہوا ہو تو؟" نجمہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"کیوں نہیں! میرا بھائی اس کے عتاب کا شکار ہو چکا ہے۔ جیل، رسوائی اور اب بے روزگاری...... اس نے چوہدری کے لیے جھوٹی گواہی نہیں دی تھی۔ یہ جرم اُسے لے ڈوبا۔"

"اور الیاس تم! کیا تمہارے بچے بھی جوتے گانٹھ کر اپنی روزی روٹی کمائیں گے؟ جس طرح تو نے اپنے ہی باپ کا کام اپنالیا ہے۔" اس نے الیاس سے پوچھا۔

"کون چاہتا ہے کہ اس کی اولاد بھی لوگوں کے جوتے تھامے مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں اپنے بچوں کو سرکاری سکول بھیجتا ہوں مگر میں جانتا ہوں کہ وہ افسر نہیں بنیں گے۔" اس نے دردمند لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ کیا ان کے سر میں بھیجا نہیں ہے؟ کیا تمہارے پاس وسائل نہیں ہیں؟ کیا تم اس ملک کے باشندے نہیں ہو؟ تم ٹیکس بھی ادا کرتے ہو مگر تم یہ تک نہیں جانتے کہ تم کتنا ٹیکس ادا کرتے ہو...... اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی؟" یہ کہہ کر اس نے سراج کی طرف دیکھ کر کہا "لوگ چاہے زبان سے کچھ نہ کہیں لیکن ان کے دلوں میں یہی سب کچھ چھپا ہے۔ وہ سوچتے بھی ہیں، مگر انہیں راستہ نہیں ملتا۔ انہیں شعور نہیں کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کیسے کریں؟"

"تم چاہتے کیا ہو؟" سراج نے پوچھا۔

"یہی کہ ہمارے ذمے جو کام ہے، ہمیں وہ کرنا ہے۔ دیکھو! چوہدری جیسے لوگ اپنی بقا، حکمرانی اور دولت میں اضافے کے لیے اپنا کام کرتے چلے جا رہے ہیں جس

کے نتیجے میں عوام پس رہی ہے۔ مگر عوام کو اس کا احساس نہیں ہے۔ وہ غریب سے غریب تر ہوتی جا رہی ہے اور لاعلمی میں انہیں لٹیروں کے ہاتھ مضبوط کرتی رہتی ہے۔" فہد یہ کہتے ہوئے بہت زیادہ جذباتی ہو گیا تھا۔

"تمہاری بات دل کو لگتی ہے لیکن بات پھر وہی ہے۔" سراج نے زور دیا۔

"لوگوں کو یہی سمجھانا ہے کہ لوہے کو کاٹنا ہی ہے تو لوہا بننا ہو گا۔" فہد نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"عوام کا اپنا مزاج ہے۔ وہ تمہاری بات کیوں سنیں گے؟" الیاس نے کہا۔

"میں دیکھ چکا ہوں کہ یہاں کے عوام میں چوہدری کے خلاف نفرت ہے۔ چوہدری کے دبدبے اور دہشت سے ڈر جاتے ہیں۔ اس گھر سے میرا جذباتی تعلق ہے۔ میں نے اس لیے بھی اسے حاصل کرنا تھا لیکن اب میں نے زمین کے لیے قطعاً کوشش نہیں کرنی۔ تم دیکھو گے کہ چوہدری منت سماجت کر کے وہ زمین مجھے دے گا۔ بس ذرا وقت لگے گا۔ اس سے عوام پر ثابت ہو گا کہ چوہدری اتنا طاقتور نہیں ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ وہ اندر سے بہت کمزور ہے۔"

"دیکھو فہد! میں چوہدری سے نفرت کرتا ہوں اس لیے میں تو تمہاری مدد کروں گا جبکہ الیاس بے چارہ تمہاری کیا مدد کر سکے گا۔" سراج نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم دیکھنا کہ لوگ کس طرح ہمارا ساتھ دیں گے۔ تم صرف میری اتنی مدد کرو کہ یہاں گاؤں میں، اس کے اردگرد جو کوئی گھر یا زمین فروخت ہو رہی ہو وہ مجھے دلوا دو۔" فہد نے کہا۔

"یہ تو بڑی بات نہیں۔" اس نے سوچ کر چند نام بتائے جو اپنی زمین یا گھر بیچنا چاہتے تھے۔

"میری ان سے بات کراؤ، پھر میں بتاؤں گا کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔"

"اچھا یار! فکر نہ کرو۔" سراج نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سمجھو! کل ہی تمہارا کام ہو جائے گا۔"

"اور پرسوں کاغذی کارروائی کے بعد رقم بھی ادا کر دی جائے گی۔"

فہد نے کہا تو اس نے حیرت سے پوچھا۔ "اتنا پیسہ ہے تمہارے پاس؟"

"ہاں ہے...... یہ کہہ کر اس نے الیاس کی طرف دیکھا۔ "تم جتنا کماتے ہو، مجھے بتا دو۔ اب تم جوتے بنانا چھوڑ کر میرے پاس رہو۔ بہت سارے کام ہوتے ہیں۔ اگر تم برا محسوس نہ کرو تو......" فہد نے کہا تو الیاس ہنس دیا۔

"اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟ میں کون سا اس کام سے خوش ہوں۔"

فہد نے کہا۔ "اب میں چوہدری کو زیادہ وقت نہیں دینا چاہتا۔"

☆☆☆

سورج طلوع ہو چکا تھا چوہدری ریاض کے ڈیرے پر نمبردار پہنچ گیا۔ وہاں پر نوکروں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلا ہی اندرونی کمرے میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ علیک سلیک کے بعد چوہدری نے پوچھا۔

"بولو کیا کہتے ہو تم......؟"

"چوہدری صاحب! سچی بات تو یہی ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اور جیسا اس کا لہجہ

ہے۔ اس سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کرے گا ضرور۔ بڑی آگ ہے اس کے لہجے میں۔" نمبردار نے بتایا۔

"ہوں!" اس نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا، "کہتا کیا ہے؟"

تب نمبردار نے اس سے ہونے والی ساری بات بتا دی تو کتنی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد بولا، "چلو اس کے بارے میں تو ہم بعد میں بات کرتے ہیں، تم ذرا یہ بتاؤ کہ گاؤں والے اس وقت خاموش تماشائی کیوں بنے رہے تھے جب ڈنگر کھولے گئے تھے؟"

"میں کیا بتاؤں جی؟ یہ تو آپ کو سوچنا چاہیے۔" نمبردار نے مؤدبانہ انداز میں اصل حقیقت کی جانب اشارہ کیا۔

"اگر یہ چھوٹے چھوٹے معاملے ہم نے ہی دیکھنے ہیں تو تم وہاں پر کیا کر رہے ہو؟" اس نے غصے میں کہا۔

"میں ان پڑھ جاہل کیا بتا سکتا ہوں؟" نمبردار نے اسے طرح دی۔

"نمبردار! تم بھول رہے ہو۔ ہمیں صرف ووٹ نہیں چاہئیں بلکہ ہم نے زمینداری بھی کرنی ہے۔ لگتا ہے تمہارے اپنے کام بڑھ گئے ہیں جو ہماری طرف توجہ کم ہو گئی ہے۔" وہ پھنکارتے ہوئے بولا۔

"میں اچھی طرح سمجھتا ہوں چوہدری صاحب! لیکن آج تک ایسا ہوا نہیں۔ آپ نے تو اس علاقے میں کوئی دوسری پارٹی نہیں اٹھنے دی۔" نمبردار نے پینترا بدل کر خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"ہم سیاسی پارٹیوں کی ضرورت بھی اسی لیے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ہم نے سیٹ نکال لینی ہے اور یہ کیسے نکلتی ہے، کیا تم نہیں جانتے ہو؟ لگتا ہے کہ تم بوڑھے ہو گئے ہو۔" چوہدری نے تیز لہجے میں کہا۔

"آپ ہی نے منع کیا تھا کہ اسے کچھ نہیں کہنا ورنہ میں چار بندے بھیج کر اسے گاؤں سے باہر پھینکوا دیتا۔" نمبردار نے شکوہ کیا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ اکیلا ہے۔ تم نے معلوم کیا کہ وہ کل سارا دن کن لوگوں سے ملا ہے اور رات کو اس کے پاس کون تھا۔"

"گاؤں کے چند کمی کمینوں کے لڑکے تھے جو کبھی اس کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ ایک سراج نامی لڑکا ہے عبدالواحد کا پتر۔ اسے تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ ذرا تیز طرار بندہ ہے۔" نمبردار نے بتایا۔

"جانتا ہوں اس مردود کو بھی۔ ایک نمبر حرام کا پلا ہے وہ۔ ہاں! تیرا کیا خیال ہے، اب اس فہد کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟" چوہدری رائے بولا۔

"کرنا کیا ہے جی! حکم کریں، اسے چوک میں کھڑا کر کے دو چار چھتر لگوا کر یہاں سے بھگا دیتا ہوں۔ پھر جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔" اس نے جھٹ سے حل بتا دیا۔

"اگر چار چھتر لگانے سے بات بنتی نظر آتی تو کب کی بن گئی ہوتی۔ اس کا یوں اتنے برس بعد آنا، یوں اپنا مکان لینا اور سب سے بڑی بات کہ گاؤں والوں کا تماشائی بنے رہنا، اس میں کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔ جا کر وہ معلوم کرو۔ اس کے ساتھ تو وہ سلوک کریں گے کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔" چوہدری نے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب!" نمبردار سر ہلاتے ہوئے کہا، "مجھے اب تک یہ سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ ایک طرف تو آپ اسے کچھ نہیں کہہ رہے ہیں، دوسری طرف وہ اپنا مکان چھین چکا تھا۔ ظاہر ہے وہ اب اپنی زمین بھی واپس لے گا۔ اس طرح تو اس گاؤں میں ہی نہیں پورے علاقے میں بھی ....." وہ تیز تیز کہتے ہوئے اچانک خاموش ہو گیا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ اس علاقے میں ہماری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوتا حتیٰ کہ کوئی اپنی جھونپڑی تک نہیں بنا سکتا مگر ...... خیر! یہ تو ایک الگ بات ہے۔ وہ زمین لے لے، اس کی اپنی ہے۔ میرا کوئی بندہ مزاحمت بھی نہیں کرے گا لیکن اسے نہیں معلوم کہ یہی زمین اس کے گلے کا پھندا بننے والی ہے اور تمہیں پتہ ہے کہ یہ میرے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔" چوہدری نے کہا۔

تو نمبردار چونک گیا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔

"اب تم جاؤ اور جو کہا ہے، اس پر عمل کرو۔ دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے۔" چوہدری نے کہا اور خود اٹھ گیا۔

☆☆☆

دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ فہد کچھ دیر پہلے ہی آیا تھا۔ سلمیٰ اس کے لیے چائے لا کر پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ اماں سلاماں کچن میں مصروف تھی جبکہ ماسٹر دین محمد عصر پڑھنے گئے تھے۔ فہد کچھ دیر چائے کے کپ سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو گھورتا رہا پھر مستفسر ہوا، "استاد جی نے کوئی بات تو نہیں کی میرے شہر جانے کی؟"

"نہیں! کہا تو کچھ نہیں۔ آپ کے بتائے بغیر شہر جانے پر متفکر تھے۔" سلمیٰ نے دھیرے سے کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بڑے ہی سنجیدہ انداز میں بولا،
"سلمیٰ! بہت سی مشورہ طلب باتیں ہیں مگر ان کی پریشانی کو دیکھ کر خاموش رہتا ہوں۔"

"وہ بوڑھے ہوگئے نا...... اس لیے آپ کو ان پر اعتماد نہیں رہا۔"

"تمہارا لہجہ بتا رہا ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو، کیا ایسا ہی ہے؟"

"میں کیوں ہونے لگی ناراض؟ آپ کی مرضی، کسی پر اعتماد کریں، نہ کریں۔" اس کے لہجے سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

"اعتماد!" اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا، "میرا یہاں آنا صرف اس لیے نہیں ہے کہ میں زمین کے ذرا سے ٹکڑے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ میں یہاں اس لیے واپس آیا تھا کہ یہاں تم ہو، استاد جی ہیں اور مجھے دنیا میں یہی دوستیاں ہی تو عزیز ہیں۔ ان پر مجھے اعتماد ہے۔"

وہ شرمائی۔ رُخ پھیر کر شکوہ کناں لہجے میں بولی، "تبھی آپ نے اب تک ہمیں یہ نہیں بتایا کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟"

فہد نے بے ساختہ شانوں سے پکڑ کر اپنی جانب موڑا۔ آنکھوں میں جھانکا اور بولا، "ہر بندہ دو طرح سے خواب دیکھتا ہے۔ بند آنکھوں سے اور کھلی آنکھوں سے۔ بند آنکھوں والے خوابوں پر ہماری دسترس نہیں ہوتی لیکن کھلی آنکھوں والے خوابوں میں ہماری امیدیں، خواہش اور آرزوئیں گندھی ہوئی ہوتی ہیں۔ سلمیٰ! میں نے بھی چند

خواب دیکھے ہیں جنہیں پورا کرنا میری آرزو ہے۔ وقت سے پہلے اگر میں ان خوابوں کو بیان کردوں گا تو ممکن ہے یہ آبگینے ٹوٹ جائیں۔"

"بات تو پھر وہی ہے نا کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔" سلمیٰ کے انداز میں طنز کا شائبہ تھا۔

"سلمیٰ! ایک خواب جو میں نے تمہارے بارے میں دیکھا ہے، اگر بیان کردوں اور اس کی تعبیر نہ ملی تو میں کتنا نامعتبر ہو جاؤں گا تمہاری نظر میں۔" وہ بولا۔

"یہ آپ کی سوچ ہے ورنہ میں انسان ہوں، دیکھتی ہوں، سوچتی ہوں اور حقیقی انداز میں فیصلہ کر سکتی ہوں۔" وہ روٹھی روٹھی بولی۔

"بات یہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو، بلکہ اس ماحول کی ہے، جس میں خوابوں کے رنگ پوری طرح نکھرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری ذات پر اعتماد کرو تا کہ ہم دونوں مل کر وہ خوابوں جیسا ماحول بنائیں۔ یہ نہ ہو کہ پہلے ہی ہمت ہار کر مجھے بے حوصلہ کردو۔"

"آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے آپ پر اعتماد کروں اور آپ جو کچھ بھی کرتے جائیں، میں اس پر کچھ نہ بولوں۔" وہ حیرت سے بولی۔

"ہاں! مجھے وہ اعتماد بخش دو۔ سنو! میں تمہیں احترام کی اس سطح پر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں تمہیں دیکھنے کے لیے مجھے بھی اپنا سر اٹھانا پڑے۔ تم فقط ماسٹر دین محمد جیسے مجبور باپ کی بیٹی نہ رہو بلکہ امیدوں کا تناور پیڑ بن جاؤ۔ یہ میری جذباتی باتیں نہیں۔ ان کے پورا ہونے میں تھوڑا سا وقت حائل ہے اور بس۔" وہ بے حد جذباتی لہجے میں کہتا

چلا گیا تھا۔

وہ تھرتھراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اور اگر ایسا نہ ہو تو ......"

"بس! یہی میں نہیں سننا چاہتا۔ اتنے برس میں نے زندگی کی بساط پر آگے پیچھے ہوتے مہروں کو دیکھا ہے۔ کون، کہاں پر، کس کو مات دیتا ہے؟ یہی دیکھتا آیا ہوں۔ اگر تم مجھ پر یقین رکھو اور میرا حوصلہ بن جاؤ تو کچھ بھی ناممکن نہیں رہے گا۔ ایک خاص منزل تک تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"میں تو چل دوں گی مگر مجھے یقین تو ہو کہ ہماری منزل ایک ہے۔"

اس کے چہرے پر پھیلتی ہوئی قوس قزح کے شرمیں اظہار نے عقدہ کھول دیا۔ ایسے سوالوں کے جواب زبان سے نہیں دیے جاتے۔ تبھی فہد نے دھیرے سے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ نلمی نے اس کی طرف دیکھا، پھر شرم سے سر جھکا کر اپنا گداز ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ بولی۔ "میں آپ کے ساتھ ہوں۔ ہر دم! ہر گھڑی! ہر جگہ......"

فہد کی گرفت لرزی۔ اس نے ایک دراز زلفوں کو چھوا اور شکریہ کہا اور اس کا ننھا سا نرم ہاتھ چھوڑ دیا۔ ایسے ہی وقت میں ماسٹر دین محمد واپس آ گئے۔

"شہر گئے تھے؟"

"جی ہاں! میں نے چا چے حیات کی زمین خرید لی ہے۔"

"وہ سڑک کے ساتھ والی؟"

"جی استاد جی!"

"مگر کیوں؟"

"مجھے ضرورت ہے اس کی۔ میں شہر اس لیے گیا تھا کہ انہیں رقم دے کر رجسٹری کرا سکوں۔" فہد دھیرے سے بولا۔

"تم اس زمین کا کیا کرو گے؟" ماسٹر دین محمد نے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ تم چند دن آئے ہو، ہو واپس چلے جاؤ گے۔ لیکن تم واقعی......"

"میں نے کہا تھا استاد جی کہ میں کشتیاں جلا کر آیا ہوں۔ واپس نہیں جاؤں گا۔ سراج کے ذریعے میں نے وہ زمین خریدی ہے۔"

"عمر حیات کے بھائی چوہدری ریاض کے کچھ چہیتے ہیں۔ وہ تم پر حق شفع دائر کر دیں گے۔" ماسٹر جی نے تشویش سے کہا۔

"آپ بجا کہتے ہیں۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔" اس نے عزم سے کہا۔

"تو ٹھیک ہے بیٹا! جیسے چاہو، کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" ماسٹر دین محمد نے کہا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے یہ الفاظ چائے لے کر آتی ہوئی سلمیٰ نے سن لیے تھے۔ اس نے کن انکھیوں سے فہد کو دیکھا اور طمانیت بھری مسکراہٹ اس کے لبوں پر سج گئی۔

☆☆☆

شہر کے علاقہ ریونیو آفیسر کے دفتر میں معززین علاقہ موجود تھے۔ ان میں چوہدری ریاض کے ساتھ فہد بھی تھا۔ اس کے ساتھ سراج بیٹھا ہوا تھا۔ جس نے پہلی بار اس طرح کی ملاقات دیکھی تھی۔ وہ خاصا خوفزدہ تھا لیکن فہد کو یقین تھا وہ خوش اسلوبی سے بات کرے گا۔ چوہدری ریاض نے چاچے عمر حیات کے بھائیوں کی طرف سے پنچایت بلائی ہوئی تھی اور وہ ان کی بھرپور وکالت کر رہا تھا۔

"اب دیکھیں جی! اس نے نقد رقم دکھا کر بہت تھوڑی قیمت پر زمین ہتھیالی ہے۔ اس سے زیادہ تو ان کے بھائی رو رہے تھے۔ اب معاملہ یہیں حل ہو جائے تو ٹھیک ورنہ ہم عدالت میں جائیں گے۔ ہم ان بیچاروں کی حمایت ضرور کریں گے۔"

"جی فہد صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا کہتے ہیں آپ؟ اعلیٰ آفیسر نے پوچھا۔

"یہ چوہدری صاحب ہیں۔ ان کے بارے میں مجھے اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ فریق بن کر آئے ہیں یا منصف؟" وہ پرسکون انداز میں مستفسر ہوا۔

"ظاہر ہے وہ پنچایتی ہیں۔" اعلیٰ آفیسر نے اپنی معاملہ فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

"معاملہ میرا اور ان کا ہے۔ نہ میں نے، اور میری معلومات کے مطابق نہ انہوں نے ہی انہیں زحمت دی ہے۔ درمیان میں یہ چوہدری صاحب کیا کر رہے ہیں؟" فہد کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

چوہدری نے بھڑک کر کہا، "یہ میرے علاقے کے لوگ ہیں۔ یہ میرے پاس اپنی استدعا لے کر آئے ہیں۔ اب میں ان کے حقوق نہیں بچاؤں گا تو کون ایسا کرے گا؟"

"اس پر میرا سوال ہے کہ چوہدری ریاض سے فیصلے کی اور وہ بھی انصاف کی توقع کی جا سکتی ہے؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ علاقے کے معزز شخص ہیں۔ ہر طرح کی پنچائت ان کے پاس آتی ہے کیونکہ ان کا شاندار سماجی اسٹیٹس ہے۔"

"لیکن میرے نزدیک نہیں ہے۔" فہد نے کہا تو سارے معززین چونک گئے۔ تھوڑے توقف کے بعد، وہ باری باری سب کو دیکھ کر بولا "جس بندے نے برسہا برس سے ایک غریب کسان کی زمین دبا رکھی ہو، اس کے گھر پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہو، اس سے انصاف کی توقع کیا کی جا سکتی ہے؟ یہ تو خود ظالم ہے۔ اگر آپ لوگوں کو یقین نہیں آتا تو چوہدری صاحب سے ہی پوچھ لیں۔"

"چوہدری صاحب! یہ کیا ماجرا ہے؟ ایک معزز نے پوچھا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ محض الزام ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے؟" وہ تیزی سے بولا۔

"چلیں! فیصلہ یہیں کرتے ہیں۔ اگر میرا کہا جھوٹ ثابت ہو جائے تو میں یہ زمین واپس کر دوں گا اور رقم بھی نہیں لوں گا اور اگر یہ جھوٹے ثابت ہو جائیں ان کی سزا کیا ہوگی؟" فہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ فقط اصل بات سے گمراہ کر رہا ہے۔ یہ جھوٹ سچ بعد میں ثابت ہوتا رہے گا، پہلے ان کا فیصلہ کیا جائے۔" چوہدری نے پہلو تہی کرنا چاہی۔

"اصل میں اس چوہدری نے میری زمین دبائی ہوئی ہے۔ چند دن پہلے میں نے اپنا گھر اس سے واپس لیا ہے۔ ان لوگوں کو اسی نے ورغلایا ہے۔ کیا یہ بھی جھوٹ ہے؟" فہد نے تیزی سے کہا۔

"چوہدری صاحب! آپ جواب کیوں نہیں دیتے۔" ایک دوسرے معزز نے کہا۔

"اصل میں اس کا باپ سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے بھاگ گیا تھا۔ اس نے چوری

کی تھی اور ......"

بکواس بند کرو چوہدری!" فہد نے دھاڑتے ہوئے کہا۔"میرے باپ پر الزام لگاتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہارے کارندوں نے میرے باپ پر ظلم کیے اور علاقہ چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ آج تم انصاف کے پیکر بنے معززین میں بیٹھے ہوئے ہو۔ خبردار! میرے باپ کی شان میں گستاخی کی تو۔"

"فہد صاحب! یہ کیا ہو گیا آپ کو؟" اعلیٰ آفیسر نے گھبرا کر کہا۔

"اس نے میری زمین دبا رکھی ہے۔ یہ اگر واپس دے دیتا تو مجھے نئی زمین خریدنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ باقی رہی بات ان کی ...... تو جب زمین کا مالک راضی ہے تو یہ کون ہوتا ہے ٹانگ اڑانے والا۔ جب مقدمہ ہو گیا تو یہ کیوں پنچائت کر کے آپ لوگوں کا وقت ضائع کر رہا ہے؟" فہد کا چہرہ فرطِ جذبات سے سرخ ہو گیا۔

"چوہدری صاحب! لگتا ہے فہد صاحب سے آپ کا کوئی پرانا لین دین ہے۔" ایک معزز نے کہا۔

"پنچائتی فیصلہ تو یہی بنتا ہے کہ زمین فہد کو دے دینی چاہیے۔" ایک بزرگ سے معزز نے کہا۔

"جی ہاں، عدالتی کارروائیوں میں بہت وقت اور پیسہ لگے گا۔ فیصلہ یہیں ہو جائے تو اچھی بات ہے۔" چوتھے نے کہا۔

"تو پھر بلا لیں دونوں کو اور پوچھیں؟" اعلیٰ آفیسر نے چوہدری سے پوچھا۔

"میرا تو خیال ہے کہ فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ ان کا حق بنتا ہے یا نہیں اگر خضر حیات

کے بھائیوں کا حق بنتا ہے تو پہلے انہیں زمین دی جائے۔" چوہدری اپنی بات پر اڑا رہا۔

"اور پھر یہ جھوٹ سچ بھی صاف ہونا چاہیے کہ کیا چوہدری نے میری زمین دبائی ہوئی ہے یا نہیں؟" فہد نے تیزی سے کہا۔

"عدالت کی طرف رجوع کیوں نہیں کیا آپ نے؟" اعلیٰ آفیسر نے فہد سے پوچھا۔

"وقت آنے پر کروں گا۔ یہ پنچائت اگر چوہدری سے بات منوا لیتی ہے تو پھر ہم اگلی بات کریں گے۔" فہد نے کہا۔

"میرے خیال میں یہ فیصلہ اب عدالت ہی میں ہوگا؟" چوہدری نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میدان چھوڑ کر مت بھاگو چوہدری! اس طرح تم ان معزز لوگوں کی توہین کر رہے ہو۔"

"اور تمہیں بات کرنا کا سلیقہ ہی نہیں ہے۔ تمہیں کیا پتہ پنچائت کیا ہوتی ہے۔" چوہدری نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے تو میں نے اپنا موقف ان معززین کے سامنے رکھا ہے۔ تم جھوٹے ہو اس لیے بھاگ رہے ہو۔" فہد نے کہا۔

"یہ جو تم چند اخبار نویسوں اور میڈیا والوں کی وجہ سے اتنا بول رہے ہونا، وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اگر سیدھی بات سننا چاہتے ہو تو سنو۔ تمہارا باپ پیشہ ور چور تھا۔

میں نے اسے گاؤں سے بھگایا۔ واہ! چور کا بیٹا میرے سامنے اونچا بول رہا ہے۔ یہی افسوس کی بات ہے۔" چوہدری نے تیزی سے غصے میں کہا۔

"چوہدری! تمہارا اور میرا سامنا ہو ہی گیا ہے تو اب دیکھنا چور کون ثابت ہوتا ہے۔ میرا باپ نہیں، تم چور ہو۔ تم بھاگ رہے تو بھاگو، میں ہر جگہ تم سے یہی مطالبہ کروں گا۔" فہد نے تیزی سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اس طرح بات آگے نہیں بڑھے گی چوہدری صاحب! معاملہ اگر اس کی زمین کا ہے تو پھر آپ واپس کر کیوں نہیں دیتے؟" اعلیٰ آفیسر نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"جس طرح غنڈہ گردی سے اس نے اپنا گھر لیا، زمین بھی لے لے۔ کس نے روکا ہے۔ ہاں! عقل مند بنتا اور بندوں کی طرح میرے پاس آتا۔ میں اسے زمین اور گھر واپس کر دیتا۔ اسے تو غنڈہ گردی کا شوق ہے۔ اس نے میرے ملازم کو اس نے مارا پیٹا۔ یہ کوئی بات ہے بھلا؟" چوہدری نے غصے سے کہا۔

"اب آپ کے پاس اس کی زمین ہے تو واپس کر دیں۔ بات ختم ہو جائے گی۔" ریونیو آفیسر اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

"میں نے کب روکا ہے؟ یہ جب چاہے، اپنی زمین لے لے۔" چوہدری کی آنکھوں میں چیلنج چھپا ہوا تھا۔

"چلیں! یہ معاملہ تو حل ہو گیا۔ فہد صاحب! آپ اپنی زمین لے لیں۔ اب دوسرا معاملہ نمٹائیں۔" وہ بولا تو دونوں جانب خاموشی چھائی رہی۔ اس نے خضر حیات کو

اندر بلایا۔ اس سے پوچھا، "مختشر صاحب! کیا آپ نے اپنی زمین رضی بہ رضا اور پوری قیمت پر فروخت کی ہے؟"

"جی بالکل! اور مجھے مکمل ادائیگی بھی ہو چکی ہے۔"

"اگر آپ کے بھائی لینا چاہیں تو؟" اعلیٰ آفیسر نے دریافت کیا۔

"نہیں ...... میں انہیں نہیں دینا چاہتا۔" اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

"اب کیا کر سکتے ہیں چوہدری صاحب!" اعلیٰ آفیسر نے چوہدری کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اتنی رقم تو وہ بھی دے رہے ہیں۔" چوہدری نے کہا۔

"میں ان کے ہاتھ زمین بیچنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ کم تو کیا، ایک ٹکا بھی نہیں دینا چاہتے، میں جانتا ہوں۔ وہ میری بیٹی کا رشتہ مانگ کر اس کے حصے کی زمین ابھی سے مانگنے لگے ہیں۔ میں یہاں سے سب کچھ بیچ کر کہیں اور جا رہا ہوں۔ عدالت میں بھی میں فہد صاحب کے حق میں بیان دوں گا۔" مختشر حیات نے تفصیل سے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ بات صاف ہو گئی ہے چوہدری صاحب!" اعلیٰ آفیسر نے کہا تو چوہدری غصے میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر فہد دھیرے سے مسکرا دیا۔ سب لوگ اٹھنے لگے تو سراج نے فہد سے کہا، "کیا چوہدری اتنی آسانی سے زمین سے دستبردار ہو جائے گا؟"

"نہیں! ہم نے اب جا کر سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالا ہے۔" فہد نے گہری سنجیدگی سے کہا اور وہاں سے اجازت چاہی۔

☆☆☆

مائرہ اس ریستوران میں داخل ہوئی جہاں جعفر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ہال پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور جعفر کو دیکھ کر اس کی جانب بڑھ گئی۔ بیٹھتے ہی اپنا پرس میز پر رکھتے ہوئے مستفسر ہوئی: ''بتاؤ! فہد کی کوئی خیر خبر رکھتے ہو؟''

''اس کے گاؤں میں ٹیلی فون سروس نہیں ہے۔ وہ قریبی شہر جاتا ہے تو مجھے کال کرتا ہے۔ شہر کچھ فاصلے پر واقع ہے، اس لیے وہاں آنا جانا کام سے ہی ہوتا ہے۔'' جعفر نے بتایا۔

''مجھے کال کیوں نہیں کرتا؟'' وہ شکوہ بھرے لہجے میں بولی۔ اس کے شکوے میں غصے کی آمیزش آشکار ہو رہی تھی۔

''اب یہ تو میں نہیں بتا سکتا لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ جب فہد سے بات ہوگی تو اس تک تمہاری شکایت ضرور پہنچا دوں گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں۔ اگر اسے میرا خیال نہیں ہے تو میں بھی اس کی توجہ کی طالب نہیں ہوں۔'' وہ ناک سکیڑ کر بولی۔

''نہیں یار! تم نہیں جانتی ہو، میں جانتا ہوں۔ جس شخص کے ساتھ اس نے جا کر متھا لگایا ہے، وہ خاصا بااثر اور الٹی کھوپڑی والا بندہ ہے۔ میں فہد کے بینک بیلنس کے بارے جانتا ہوں۔ اس لیے کہتا رہتا ہوں کہ اسے ہماری ضرورت پڑے گی۔ اصل میں اس کی ساری توجہ اپنے معاملات پر مرکوز ہے۔'' جعفر نے سمجھایا۔

''میں نے وہاں کے میڈیائی نمائندہ سے رابطہ کیا تھا۔ ان کے ذریعے مقامی ڈی

ایس پی تک یہ بات پہنچا دی تھی کہ فہد معمولی شخص نہیں ہے، اس کا خصوصی خیال رکھا جائے۔ ممکن ہے فہد اور چوہدری کی چپقلش میں دنگے فساد کی نوبت آ جائے۔" وہ خوفزدہ ہو کر بولی۔

"وہ تو ہو گا ہی، کبھی نہ کبھی تو ضرور ہو گا۔ لیکن وہاں کا ماحول کیسا ہے؟ یہ نہیں معلوم اور ہمیں تو یہ بھی نہیں معلوم ناں کہ وہ آئندہ کیا کرنا چاہتا ہے۔"

"خیر! جو بھی ہو گا، ہم اسے تنہا تو نہیں چھوڑ سکتے ناں!"

"ہاں! میں نے کافی حد تک ادھر اُدھر سے رقم کا بندوبست کر رکھا ہے۔ وہ جیسے ہی مانگے گا، میں دے دوں گا۔ ویسے ایک دن اس نے مجھ سے بات کی تھی کہ وہاں پر بزنس کے بھی چانس ہیں۔" جعفر نے اشارتاً کہا۔

"میں سمجھ رہی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس کا حتمی فیصلہ تو پاپا کریں گے، میں تو بزنس سے تعلق نہیں رکھتی۔ ویسے میں اس کا ماحول جانتی ہوں۔" اس نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

"ایک اور بات! اگر اس نے وہاں کسی لڑکی کو اپنا دل دے دیا، مطلب، کسی سے عشق ہو گیا اسے تو پھر تم کیا کرو گی؟ ..... وہ سیانے کہتے ہیں ناں کہ ....."

"سیانے جو بھی کہتے ہیں، مجھے پروا نہیں۔ میں اپنی محبت پر یقین رکھتی ہوں۔ اسے مجھ سے کوئی چھین نہیں سکتا۔" یہ کہہ کر وہ خیالوں میں کھوئے انداز میں بولی، "جعفر! بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس پر بہت زیادہ بھروسہ ہو، وہ اس لیے بھی نظر انداز ہو جاتا ہے کہ دوسرا اسے خود سے جدا تصور نہیں کر رہا ہوتا۔ میں نے سوچا ہے،

فہد کے اپنے خواب ہیں۔ جنہیں وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ تم نے بتایا، دراصل وہ اپنے اندر کی جنگ جیتنا چاہتا ہے، میں سمجھتی ہوں کہ فیصلہ چاہتا ہے وہ۔ اس جنگ کو وہ اپنے اندر سے ختم کرنا چاہتا ہے۔ اور ایسا اسے کر ہی لینا چاہیے ورنہ آخری سانس تک وہ خود سے بھی لڑتا رہے گا۔"

"میں بھی کچھ ایسا ہی سوچتا ہوں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"ہاں! ہماری دوستی یا اپنی محبت کو اس طرح منوا سکتے ہیں کہ اس جنگ کا فیصلہ ہر حال میں جیت کی صورت میں اسے دیں تا کہ وہ باقی زندگی سکون سے بسر کر سکے۔ تب وہ جس کا بھی ہوگا، پورے کا پورا ہوگا ورنہ ادھورا رہ جائے گا۔ کسی کو بھی پوری محبت نہیں دے سکے گا۔" مارؔہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ایک بات اور ہے مارؔہ! ہم جو اس کے ساتھ دوستی اور محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، کیا اس انتظار میں ہیں کہ وہی ہمیں مدد کیلئے پکارے، تو ہم تب اس کی مدد کو جائیں۔ کیا ہمیں خود سے کچھ نہیں کرنا چاہیے؟" اس نے کہا۔

"ہمیں خود سے کرنا چاہیے لیکن ہمیں معلوم تو ہو کہ ہماری ضرورت کہاں پر ہے؟"

"اب دیکھو! سب سے پہلے اس سے رابطہ کی کوشش ہے، میں نے یہاں ایک سیل کمپنی سے بات کی ہے، میرے خیال میں چند ملاقاتوں کے بعد یہ فون رابطے والا مسئلہ حل ہو جائے گا پھر جس وقت جو چاہے، اس سے پوچھا جا سکے گا۔ تب اس کی باتوں سے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ اسے ہماری کس مدد کی ضرورت ہے۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" وہ سر ہلا کر بولی۔

''اچھا وہ بات تو درمیان میں ہی رہ گئی۔'' جعفر نے سنجیدگی سے کہا۔

''کون سی بات؟'' وہ چونکی۔

''یہی کہ اگر اسے وہاں کسی لڑکی سے عشق وشق ہو گیا تو تم کیا کرو گی؟''

''میں نے تمہیں بتا تو دیا ہے۔ میں عام نہیں ہوں۔ خاص ہوں۔ دیکھنا، وہ خود ہی مجھ سے کہے گا۔'' وہ بڑے فخر سے بولی۔

''خدا کرے کہ تمہاری خوش فہمی درست ثابت ہو۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''اچھا! تم اس کی باتیں کرتے رہو گے یا کھانے وانے کا آرڈر بھی دو گے؟'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہمیشہ اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھانے پر کمربستہ رہتی ہو۔ خود سے کبھی نہ کھلانا۔ ہاں!'' اس نے کہا تو مارّہ کے لبوں پر مسکراہٹ موجزن ہو گئی اور اس نے قریب کھڑے ویٹر کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ وہ جعفر کے سامنے اپنا غبار خاطر نکال کر ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ جہاں پر ظلم ہو وہاں ظالم کیلئے نفرت موجود نہ ہو۔ چونکہ مظلوم بے اختیار اور کمزور ہوتا ہے، اس لیے خوف سے دبا رہتا ہے۔ اسے کوئی ایسا راستہ یا سہارا نہیں مل پا رہا ہوتا جس سے وہ اپنی نفرت کا اظہار کر سکتا ہو۔ فہد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ پورے علاقے میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو کمزور تو ہیں لیکن کسی نہ کسی حوالے سے چوہدری یا اس کے کارندوں کے ہاتھوں ظلم کا شکار ہو

سمجھتے ہیں۔ فہد کی آمد کے ساتھ چوہدری کا رعب داب کم ہو گیا تھا۔ دوسری جانب لوگوں کی نگاہوں میں فہد طاقت کی علامت بن کر سامنے آیا تھا۔ اس کے کچے گھر میں لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اس نے بے شمار کہانیاں سنیں، لوگوں کے دکھ درد اور مسائل سے آگہی حاصل کی اور ممکنہ حد تک ان کی مدد بھی کی۔ سراج نے ہر جگہ بیٹھ کر شہر میں ہونے والی پنچائت کا تذکرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرتا تھا۔ چاچے خضر حیات نے نہ صرف زمین کا قبضہ دے دیا تھا بلکہ یہ وعدہ بھی کر لیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی کے بعد وہ یہاں کا گھر بھی اسے فروخت کر کے چلا جائے گا۔ بہت سارے دن گزر جانے کے باوجود فہد نے اپنی زمین کا قبضہ نہیں لیا تھا۔ اسے یہ احساس تھا کہ چوہدری یہیں پر اس کیلئے گھات لگائے بیٹھا ہو گا۔ جبکہ ہر طرف سے یہی سوال اٹھنے لگا تھا کہ وہ اپنی زمین واپس کیوں نہیں لیتا تھا۔ وہ ہنس کر ٹال جاتا۔ گاؤں کے لوگ بھی آنکھیں رکھتے تھے۔ ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ شہر سے کافی لوگ گاڑیوں پر اس سے ملنے آتے تھے۔ کچھ دنوں سے سیل فون کمپنی نے سراج کے ڈیرے پر ٹاور لگانا شروع کر دیا تھا۔ پورے علاقے میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ اس دن وہ رات کا کھانا کھا کر اپنے استاد کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے دریافت کیا، "تم نے گاؤں میں دو کنال کا پلاٹ کیوں خریدا ہے؟"

"اچھا کیا جو آپ نے پوچھ لیا مگر میں نلی کے آنے پر جواب دوں گا۔"

دروازے سے لگ کر کھڑی نلی چائے اٹھائے ان کے پاس پہنچ گئی۔ تب ماسٹر جی نے پوچھا، "تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آ گئی؟"

"سچ پوچھیں تو میں ساری جمع پونجی لگا چکا ہوں۔ اب میرے پاس مزید کچھ نہیں ہے۔" فہد نے دھیرے سے کہا۔

"تو یوں کیوں ضائع کر رہے ہو؟ خضر حیات سے جو زمین لی تھی، اس کا قبضہ لینا باقی ہے۔ تمہاری زمین ان کے قبضہ میں ہے۔ پونجی تم نے لٹا دی۔ وہ جو تم فیکٹری کی بات کر رہے تھے، اس کا کیا ہوگا؟ یہی رقم اگر تم شہر میں کسی کاروبار پر لگاتے تو بہتر تھا۔" ماسٹر دین محمد کے لہجے میں گہری تشویش مضمر تھی۔

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ سب ہوتا رہے گا۔ میں تو دو کنال کے پلاٹ کے بارے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"لو! سلمیٰ بھی آ گئی ہے۔ اب بتاؤ۔" ماسٹر جی نے کہا۔

فہد نے پوچھا، "سلمیٰ! اگر میں تمہیں ایک اچھا سا سکول بنا کر دوں تو کیا تم اُسے چلاؤ گی؟"

"مطلب؟ سکول؟ میں کچھ سمجھی نہیں۔"

"ہاں! یہاں کی بچیاں صرف پرائمری کلاس تک پڑھ سکتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بہت آگے تک پڑھیں۔ جو تمہاری طرح پڑھ چکی ہیں، وہ سکول میں معلمہ بن جائیں اور علم کی روشنی بانٹیں۔" اس نے لگن سے کہا۔

"میں کر تو لوں گی مگر......" سلمیٰ کو تذبذب تھا۔

"مگر کیا؟" وہ جلدی سے بولا، "میں تمہاری مدد کروں گا ناں!"

"ٹھیک ہے...... میں کوشش کروں گی۔" وہ بولی۔

"پھر آج سے ہی تم اپنا کام شروع کر دو۔ میں اس پر عمارت بنواتا ہوں، تم تب تک اسٹاف اور داخلہ لینے والی بچیوں کے بارے ہوم ورک کر لو۔"

"وہ تو ہو جائے گا مگر تمہارے پاس عمارت کیلئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تمہارے پاس اب کچھ نہیں بچا۔" ماسٹر دین محمد نے اُسے گھورا۔

"لا جی! جب وہ کہہ رہے ہیں کہ ہو جائے گا تو ہو جائے گا۔ بابا! کیا ہم ان کا ساتھ نہیں دیں گے؟" سلمیٰ نے لاڈ سے کہا تو ماسٹر دین محمد نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ پھر سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ سمجھ گیا تھا۔ اِس بیچ نے نہ صرف اُسے کئی اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا بلکہ اُسے ایک طمانیت کا احساس بھی بخشا تھا۔

"استادِ محترم! کیا آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی؟" فہد نے پوچھا۔

"اچھی ہے، بہت اچھی ہے۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو۔ دراصل تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے بندے کو حقیقی معنوں میں شعور ملتا ہے۔ علم ہی حیوانیت سے انسانیت کی طرف لاتا ہے۔ ہمارے ملک پر جاگیرداروں کا جو تسلط قائم ہے، اس کا خاتمہ تعلیم سے ہی ممکن ہے مگر...... مگر جس کام کا تو نے بیڑا اُٹھا لیا ہے، یہ اپنے منطقی انجام تک پہنچے گا تو فائدہ مند ثابت ہو گا ورنہ مایوسی کے پہلے سے بھی گہرے بادل منڈلانے لگیں گے۔ ادھورا مشن لوگوں کا حوصلہ توڑ کر رکھ دے گا۔" ماسٹر دین محمد کے لہجے میں تردد اور تشویش ہلکورے لے رہا تھا۔

"آپ بجا کہتے ہیں مگر دعا کریں کہ اللہ رب العزت مجھے استقامت اور قوت دے۔" فہد نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

"میری دعائیں تو ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں بیٹا!" ماسٹر دین محمد نے پھر دھیرے سے کہا۔

"اصل میں استاد جی! یہ آپ سمجھتے ہیں کہ فقط تعلیم سے کچھ بھی نہیں ہوتا جب تک اس میں روح نہ ہو۔ میں فقط چوہدری کے خلاف نہیں ہوں، بلکہ چوہدری جیسے بندوں کی سوچ کے خلاف ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ اس کے نتائج حاصل کرنے میں وقت لگے گا، ممکن ہے اس فصل پر ثمر میرے مرنے کے بعد آئے مگر میں بارش کا پہلا قطرہ بننا چاہتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایسی سوچ رکھنے والے بندے اپنی اولاد کو تعلیم دینے لیے غیر ممالک تک بھجوانے کا بندوبست کرتے ہیں مگر اپنے ہی وطن میں جتنے بھی منصوبے بنتے ہیں، انہیں ناکام کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ میں ان کی مذموم حرکات کو لگام ڈالنا چاہتا ہوں اُستاد جی!"

فہد نے اپنے استاد کے سامنے اپنا مطمع نظر رکھا جس پر دونوں کے درمیان خاصی طویل بحث چھڑی۔ بحث کی بساط فہد کے ماننے پر سمٹ گئی۔

وہ اپنے گھر پہنچا۔ الیاس کے ساتھ سراج کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے ساتھ ایک اور بوڑھا شخص موجود تھا جسے فہد پہچان نہیں سکا۔ سراج نے بزرگ کا تعارف کرایا، "فہد! یہ بابا نعمت علی ہے۔ اس بندے کا باپ ہے جس کے پاس تمہاری زمین ہے۔ پہلے یہ وہیں کاشتکاری کرتا تھا، اب اس کا بڑا بیٹا وہاں کام کرتا ہے۔ یہ تم سے کچھ پوچھنے آیا ہے۔"

"جی! کہیں بابا جی؟" فہد نے احترام سے پوچھا۔

"بیٹا! میں نے ساری زندگی چوہدریوں کی نوکری میں گزاردی ہے۔ اچھا بھلا جیسا بھی تھا، میرا وقت گزر گیا۔ میں سارے حالات کے بارے جانتا ہوں۔ جس دن تم آئے تھے، اسی دن میں سمجھ گیا تھا کہ تم اپنی زمین واپس لے کر ہی رہو گے۔ گھر خالی کروانے کے بعد اتنی دیر بعد تک تم نے اپنی زمین نہیں لی تو مجھے اس میں بڑا خطرہ دکھائی دیا۔ مجھے آج ہی پتہ چلا ہے کہ چوہدری نے میرے بیٹے کو بندے تیار رکھنے کا حکم دیا ہے کہ اگر تم زمین واپس لینے کیلئے وہاں پہنچو تو تمہیں آڑے ہاتھوں لیا جائے۔" بوڑھا حاجت علی یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"اس کا مجھے پوری طرح احساس ہے بزرگو! آپ کیا چاہتے ہیں، یہ بتائیں۔" فہد نے مسکرا کر کہا۔

"میں یہی چاہتا ہوں کہ خون خرابہ نہ ہو۔ میرا بیٹا جذباتی ہے۔ ناسمجھ ہے۔ وہ چوہدری کی انگلیوں پر ناچتا ہے اور پوری طرح تمہارا راستہ روکنے کیلئے تیار ہے۔ کوئی ایسی راہ نکالو کہ فتنہ فساد نہ ہو اور زمین تمہیں مل جائے۔" اس نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔

"بابا جی!" سراج نے دخل دیا، "اگر آپ کا بیٹا، آپ کی بات ہی نہیں مانتا تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

فہد نے کہا، "میں امن چاہتا ہوں لیکن ظلم کے آگے سر نہیں جھکا سکتا۔"

سراج نے سینہ ٹھونکا، "اگر فہد کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو ہم اس کا ساتھ دینے پہ مجبور ہوں گے بابا جی! چوہدری تو چاہتا ہی یہی ہے کہ ہم آپس میں لڑ جھگڑ کر برباد ہو جائیں۔ مریں مارے جائیں۔ فائدہ چوہدری کو ہی پہنچے گا۔"

"میں نے بھی یہی سمجھا ہے کہ جیسے دوسرے لوگوں کو ابھی تک شک وشبہ ہے کہ فہد آج آیا ہے، کل چلا جائے گا لیکن اب لگتا ہے کہ یہ ادھر ہی رہے گا۔ یہاں پر جائیداد خریدنے کا مطلب یہی نکلتا ہے ناں ...... لوگوں کو بھی اب یقین آنے لگا ہے۔ میں چوہدری کے فائدہ میں اپنی نسل سے دشمنی نہیں کر سکتا۔ مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟" نعمت علی نے مدد طلب نظروں سے فہد کو دیکھا۔

"بابا جی! یہ میرا گاؤں ہے اور میں نے یہیں رہنا ہے۔ آج نہیں تو کل، زمین چوہدری کو دینا ہی ہوگی۔ اب یہ فیصلہ آپ کے بیٹے کو کرنا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ اگر وہ صرف زمین چاہتا ہے تو کاشتکاری کرتا رہے۔ میں اُسے نہیں اٹھاؤں گا۔ اگر وہ لڑنا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔ وقت آنے پر......"

"نہیں بیٹا!" نعمت علی نے ہاتھ اُٹھا کر اس کی بات کاٹی، "دو مہینے تک فصل تیار ہو جائے گی۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا نقصان نہ ہو۔ زیادہ جگہ پر تو چوہدری نے اپنا مال ڈنگر باندھ رکھا ہے یا چارہ کاشت کر رکھا ہے۔ وہ غریب ......"

"وہ غریب مجھ سے آ کر بات تو کرے۔ میں اس کا نقصان نہیں ہونے دوں گا۔" فہد نے حتمی انداز میں کہا۔ بوڑھے نعمت علی کے چہرے پر سے الجھن رفو ہوگئی۔ پھر ان میں طے پایا کہ وہ کس طرح اپنے بیٹے کو سمجھائے گا۔

اگلی صبح وہ چوپال میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں بہت سارے لوگ موجود تھے۔ اسی وقت بوڑھا نعمت علی اپنے بیٹے کو لے آیا۔ فہد نے وہاں موجود لوگوں سے کہا کہ اس کی فصل کا تخمینہ لگائیں۔ مناسب رقم طے ہوتے ہی اس نے شام تک ادائیگی کا وعدہ کیا۔ وہ

مطمئن ہو کر چلے گئے تو سراج نے فہد سے کہا۔ "شام تک کا وقت کیوں دیا؟ ابھی اسے رقم دے کر لکھوا لیتے ہو رقعہ۔ ختم ہو جاتا۔"

"میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔" فہد نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" سراج چونکا۔ "بھلے آدمی! مجھے کہہ دیا ہوتا یا اس سے چند دن کی مہلت لے لی ہوتی۔ اب کیا ہوگا؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کرو۔ کسی کو یہ مت بتانا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" فہد نے کہا۔ سراج نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر فکر و تردد کی غماز پرچھائیاں لرزنے لگی تھیں۔ وہ سمجھ گیا۔ فہد کا کندھا تھپتھپا کر بولا۔ "تم گھبراؤ نہیں ...... میں کچھ کرتا ہوں۔"

سراج عزم لے کر اٹھا اور چلا گیا۔ فہد نے ماسٹر دین محمد کے گھر کا رخ کیا۔ ماسٹر جی حسب معمول چارپائی پر پڑے تھے۔ سلمٰی اندرونی کمرے میں کسی کتاب پر جھکی ہوئی تھی۔ اسے فہد کی آمد کی خبر ہو گئی۔ کتاب بند کر کے ماسٹر اور فہد کے پاس چلی آئی۔ مستفسر ہوئی۔ "آپ کیلئے چائے لاؤں؟"

"نہیں ...... دل نہیں چاہ رہا۔" وہ بلا تکلف بولا۔

ماسٹر دین محمد نے اس کے متفکر چہرے کو دیکھا۔ "خیریت ہے فہد؟ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں، بس سوچ رہا ہوں کہ شہر جاؤں یا نہ جاؤں۔ اس لیے کپڑے تبدیل کرنے آیا تھا۔" وہ دھیرے سے چلا۔

"شہر کیا لینے جا رہے ہو؟" ماسٹر دین محمد تشویش سے پوچھا۔ اس نے مختصراً سارا

معاملہ کہہ دیا۔ تو انہوں نے پوچھا "تو شہر سے تم رقم لینے جا رہے ہو؟"

"جی!" فہد نے کہا اور سلمٰی کی جانب دیکھ کر بولا، "میرے کپڑے؟"

وہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔

☆☆☆

سہ پہر کے وقت چوہدری ریاض کے ڈیرے پر کافی لوگ جمع تھے جن میں زیادہ تر فہد ہی کے گاؤں کے تھے۔ نمبردار اور زمان بھی وہیں تھے۔ بابا نعمت علی کے بیٹے نذیر اور فہد میں طے پانے والا معاہدہ ان کے درمیان زیر بحث تھا۔ چوہدری ریاض نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا، "اس کا مطلب ہے کہ اصل کام بابے نعمت نے دکھلایا ہے جس نے جا کر فہد سے بات کی۔ ساری زندگی ہمارا کھاتا رہا، اب ہمارے خلاف ہو کر اس سے جا ملا۔"

"اس دن بھی آپ نے کہا تھا کہ میں وہاں پر کیا کر رہا ہوں، اب لوگ اپنا مفاد دیکھتے ہیں۔ کسی کو نہیں پوچھتے۔" نمبردار نے کہا۔

"او یار! پہلے کون سا اپنا مفاد نہیں دیکھتے تھے۔ ہم نے ان لوگوں پر کیا کیا احسان نہیں کیے۔ لوگ بڑے احسان فراموش واقع ہوئے ہیں۔" چوہدری نے تیز لہجے میں گلہ کیا۔

"اب کیا کیا جائے چوہدری صاحب؟ ...... وہ تو اپنی زمین کا قبضہ آج شام کو لے لے گا۔ زیادہ کرے گا تو صبح تک ٹھہر جائے گا۔ اپنی تو بات نہ رہی ناں!" نمبردار نے دھیرے سے کہا۔

"تم اس نذیر کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟ میں یہاں اس کی چھترپریڈ کرتا۔ خیر! دیکھتے ہیں۔ ابھی کون سا اس نے قبضہ دے دیا ہے۔" چوہدری نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں تو آپ کا حکم سننے کیلئے حاضر ہوا تھا۔" نمبر دار نے اپنی وفاداری جتائی۔

"اتنی عمر گزار دینے کے باوجود بھی تمہیں نہیں معلوم کہ تم نے کیا کرنا ہے تو پھر جاؤ! میرے خیال میں اب تم بوڑھے ہو گئے ہو۔" چوہدری کا لہجہ طنزیہ تھا۔

وہاں موجود لوگوں نے نمبر دار کو دیکھا۔ اسے بکی ہوئی۔ بولا، "نہیں جی! میں آپ کا تابع دار ہوں۔ میرے بندے تیار ہیں۔ جب بھی آپ حکم دیں گے، سب اُٹھ کھڑے ہوں گے۔"

"بس پھر تیار رہنا۔ جا کر نذیرے کو سمجھاؤ۔" چوہدری نے قدرے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو نمبر دار اپنے ساتھ آئے ہوئے بندوں کو لے کر چلا گیا۔

دونوں باپ بیٹا رہ گئے۔ بیٹا بولا، "ابا جی! آپ پتہ نہیں کس مصلحت سے کام لے رہے ہیں۔ فہد کو پہلے دن ہی سبق سکھا دیا ہوتا تو وہ اب ہماری زبان بول رہا ہوتا۔ جس طرح دن گزرتے جا رہے ہیں، وہ لوگوں میں اپنی جگہ بناتا جاتا ہے۔"

"یہی تو بات ہے، وہ اسلحے سے نہیں، دماغ سے لڑ رہا ہے۔ تم میں یہ قوت نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں اس سے دوستی گانٹھ لینی چاہیے۔" چوہدری نے اپنے شیر جیسے بیٹے کو بہ نظرِ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

"دوسرے لفظوں میں اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے۔ ہے ناں؟ ابا جی! اس طرح

تو ہماری بڑی بے عزتی ہوگی۔" زمان کا لہجہ باغیانہ محسوس ہو رہا تھا۔

"تو بتاؤ! ہم یہ نہ کریں تو کیا کریں؟ مجھے نذیرے پر اعتماد تھا، اب وہی......"

"لا جی! اب میں قدم اُٹھاتا ہوں، آپ دیکھتے رہیں۔" زمان یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے ہمیں جھکنا پڑے۔" باپ نے تنبیہ کی۔

"جھکنا کیوں پڑے گا؟ ہمارے ہی کمین ہی ہمارے خلاف بغاوت کریں تو پھر ہمارا جینا کیا ہوا؟" زمان نے فاخرانہ انداز میں چھاتی پھلائی اور باہر نکل گیا۔

ڈیرے پر ہی اس کے چند پالتو غنڈے موجود تھے۔ اس نے انہیں ساتھ لیا اور اپنی لینڈ کروزر میں بیٹھ کر فہد کے گاؤں پہنچ گیا۔ سورج ڈھل گیا تھا۔ چوپال میں کچھ لوگ موجود تھے۔ کچھ نماز پڑھنے کیلئے مسجد جا رہے تھے۔ زمان نے وہیں جا کر گاڑی روکی اور اتر کر کھڑا ہو گیا۔ قریبی دکاندار کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا، کہا، "نذیرے کو بلا لاؤ۔"

"جی اچھا! میں بلا لاتا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے تو یہیں تھا۔" دکاندار نے زمان کے تیور دیکھتے ہی وہاں سے فوراً ہٹنے میں عافیت جانی۔

"یہاں کیا کر رہا تھا وہ؟" زمان نے بلند آواز میں پوچھا۔

"جی! یہاں اس نے فہد سے رقم لی ہے اور پٹواری کے سامنے زمین کی کاشتکاری سے دستبرداری کے کاغذ پر انگوٹھا لگایا ہے۔ گاؤں کے بہت سے لوگ یہاں موجود تھے۔" اس نے دور کھڑے رہ کر تفصیل بتائی۔ اس دوران وہاں پر لوگ جمع ہونے

گئے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ چوہدری زمان اتنا برہم کیوں تھا۔ زمان نے اپنے غنڈوں سے کہا، "آؤ! اس کے پاس چلتے ہیں۔ گھر پر۔"

ڈرائیور نے اس کے اشارے پر گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ چند گلیاں گھومنے کے بعد وہ نذیر کے کچے مکان کے سامنے تھا۔ اپنے خاص کارندے سے مخاطب ہوا، "اُسے باہر نکال لاؤ۔"

اس کا کارندہ گن لہراتا ہوا نذیر کے گھر میں گھس گیا۔ چند ہی لمحوں میں اُسے کلائی سے پکڑ کر کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ نذیر کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ رہا تھا۔ اس دوران کافی لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔

"اوئے نذیرے! تمہاری یہ جرأت کہ ہم سے پوچھے بغیر سودا کر لیا؟ رقم بھی پکڑ لی۔ بولو!" زمان کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

"معاف کر دیں جی......" نذیر کے بولنے سے پہلے ہی بوڑھا نعمت علی ہاتھ جوڑے سامنے آ گیا۔

"ساری شیطانی ہی تیری ہے بڈھے!" زمان نے غیظ بھرے انداز میں کہا اور قدم بڑھا کر زوردار طمانچہ نعمت علی کو جڑ دیا۔ وہ ضعیف تھا۔ سہہ نہ پایا اور دور لڑھک گیا۔ پھر اٹھ کر اس کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ زمان کا ہاتھ پھر ہوا میں بلند ہوا۔ نذیر حائل ہو گیا۔ بولا، "بس کرو چوہدری صاحب! میں نے اپنی مرضی سے پیسے لیے ہیں۔ لاجی کا اس معاملے میں کوئی عمل دخل نہیں۔"

"اوئے تیری یہ اوقات!" زمان نے پاگلوں کی مانند چیخ کر کہا اور اس پر پل پڑا۔

وہ مار کھاتا رہا۔ تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش برستی رہی۔ نعمت علی بار بار ہاتھ باندھ کر سامنے آ رہا تھا۔ منت سماجت کر کے بیٹے کو اُس کی بربریت سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسے ہی لمحوں میں نذیر کے ہاتھ میں ایک پتھر آ گیا۔ اس نے پورے جوش سے زمان کے سر میں دے مارا۔ پھر تیزی سے قریب کھڑے غنڈے کے ہاتھ سے گن چھین لی۔ اس نے اتنی تیزی سے یہ جسارت کی تھی کہ گن بردار کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ یہ بہت نازک مرحلہ تھا۔ وہ خوف زدہ تھا۔ کسی بھی لمحے گولی مار سکتا تھا۔ زمان اُسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ تبھی اس نے گن پکڑی اور فائر کر دیا۔ نذیر لمحوں میں ہی خون سے لت پت ہو گیا۔ وہاں پر موجود لوگ خوف سے سن ہو گئے۔ چند لمحوں بعد جیسے ہی ہوش آیا اور وہ وہاں سے ہٹنے لگے۔ کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ زندگی کی بازی ہارتے ہوئے نذیر کو اُٹھاتے اور سنبھالتے۔ زمان نے چاروں طرف دیکھا۔ غیظ بھری آواز میں کہا، ''اوئے! سب لوگ سن لو۔ اب کسی نے ہمارے خلاف سوچنے کی کوشش کی تو اس کا اس سے بدتر انجام کیا جائے گا۔ کوئی شک و شبہ میں نہ رہے۔''

یہ کہہ کر اس نے گن پاس کھڑے ساتھی کو تھمائی اور اپنی لینڈ کروزر میں بیٹھ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد لینڈ کروزر مٹی اُڑاتی گاؤں سے نکل گئی۔ زمان نے ایک پل کو مڑ کر نہیں دیکھا تھا کہ نذیر گولی کھانے کے بعد مر گیا تھا یا اس میں زندگی کی رمق باقی تھی۔ اس کے کانوں میں نعمت علی کی ہیجانی چیخ و پکار کچھ دیر تک تو بازگشت چھیلاتی رہی پھر معدوم ہو گئی۔

وہ گاؤں میں اپنی دہشت جمانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

گاؤں پر خوف وہراس چھایا ہوا تھا۔ نذیر کی رسمِ قل پر اتنا بڑا اجتماع نہیں ہو سکا تھا۔ گاؤں کی مسجد میں لوگ جمع ہوئے، ایصالِ ثواب کی دعا ہوئی اور لوگ بنا کوئی تبصرہ کیے لوٹ گئے۔ فہد وہیں تھا۔ وہ افسردہ سا مسجد سے نکل کر چوک میں آ بیٹھا۔ وہیں سراج بھی آ گیا۔ اس کے ساتھ چند لوگ تھے۔ وہ بھی مسجد سے نکلے تھے۔ ان کے بیٹھنے پر فہد نے بڑی آزردگی سے کہا، ''اس گاؤں میں آج ہم نذیر کے قل پر جمع ہوئے ہیں۔ کل ایسا ہی واقعہ گاؤں کے کسی اور جوان کے ساتھ پیش آئے گا۔ سب جانتے ہیں کہ قتل کس نے کیا ہے مگر پولیس ایک فیقے نام کے بندے کو پکڑ کر لے گئی ہے جس نے اقرارِ جرم بھی کر لیا ہے۔ ظالم تو صاف بچ گیا ناں!''

''یہ اس لیے بیٹا کہ جب مقتول کے ورثا ہی مدعی نہیں بنے۔ چوہدری فیقے کی بھی ضمانت کروا لے گا۔ کیس کی عدم پیروی کی وجہ سے فیقا بھی صاف بچ جائے گا یا زیادہ سے زیادہ دو چار سال جیل ہو جائے گی۔'' ایک بزرگ نے دکھ سے کہا۔

''فہد! کیا تمہیں نہیں پتہ کہ انصاف کیلئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے؟ کتنا پیسہ لگانا پڑتا ہے۔ دفتروں کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔'' سراج نے قدرے غصے سے کہا۔ وہ ایک کیس کے سلسلے میں چوہدری کے مقابلے میں عدالتوں کے دھکے کھا چکا تھا۔

''بلکہ پتر! جب گواہی نہیں ملیں گے تو عدالت بھی کچھ نہیں کر سکے گی۔ فیصلہ ثبوت اور پکی گواہی پر ہوتا ہے ناں!'' اسی بزرگ نے دکھ سے کہا۔

''کیا یہاں کے لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے؟ ذرا حوصلہ کرنے کی دیر ہے۔ یوں

خوف زدہ رہے تو یہ ظلم ہوتا رہے گا۔ آج نذیر قتل ہو گیا ہے۔ کل کوئی اور قبر میں چلا جائے گا۔" فہد نے غمگین لہجے میں کہا تو وہاں پر خاموشی چھا گئی۔ پھر اس موضوع پر کوئی نہیں بولا۔ وہ ابھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے گلی میں سے چند لوگوں کے ساتھ نذیر کی بیوہ اپنے تین بچوں کے ساتھ اس طرف آتی دکھائی دی۔ اس کے سر کا آنچل ڈھلک کر زمین پر گھسٹتا آ رہا تھا۔ تبھی چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔

وہ سامنے آئی۔ آنکھیں خوفناک حد تک ویران تھیں۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ ایک بیٹے پر رکھا ہوا تھا جبکہ دوسرا بیٹی پر۔

ایک عمر شخص نے دریافت کیا، "صغیہ پتر! کیا بات ہے؟ تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"میں فہد کے پاس آئی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا آنچل پھیلا دیا۔ اس کے پلو میں موٹی گرہ پڑی ہوئی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے گرہ کھولی تو کافی سارے نوٹ زمین پر بکھر گئے۔ دیوانگی آمیز انداز میں بولی، "یہ وہ رقم ہے جو میرے سائیں نے تم سے لی تھی۔ اسی رقم میں چوہدری زمان نے اُسے قتل کر دیا۔ میرا سسر اور میرے دیور تو میرا ساتھ نہیں دیتے مگر میں فہد کے پاس آئی ہوں۔ یہ کہنے کہ یہاں تمہارے سوا کوئی مرد نہیں رہتا۔ سب زنانے ہیں۔ تم میری مدد کرو۔"

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا، بولا، "کھل کر بات کرو۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں صرف تم سے مدد مانگنے آئی ہوں۔ مرد ہو تو وعدہ کرو نہیں تو گاؤں کے زنخوں کی طرح سر جھکا کر پرے ہٹ جاؤ۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

"م...... میں تمہاری مدد کروں گا مگر......" فہد کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"ہاں! تم بھی اگر مگر کرنے لگے ہو۔ بزدل چوہے ہو۔ یہ سارا پنڈ چوہوں سے بھرا ہوا ہے۔ کسی ماں نے شیر نہیں جنا۔" اس کی لرزہ خیز آواز نے سبھی سننے والوں کو زمین میں گاڑ دیا۔

"حوصلے سے کام لو۔ بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟" فہد کا دماغ سلگ رہا تھا۔

"مجھے ماسٹر جی کی دھی نلمی نے کہا ہے کہ گاؤں میں ایک ہی مرد کا بچہ ہے جو میری مدد کر سکتا ہے۔ اُسے جا کر بتاؤں گی کہ تم بھی اگر مگر کرنے لگے ہو۔ میں کیا چاہتی ہوں؟ میں تو اپنے سائیں کے قاتل کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ اپنے بچوں کو یتیم کرنے والے کی موت چاہتی ہوں۔ جانتی ہوں کہ اس کام میں بہت سی رقم لگے گی۔ وہی دینے آئی ہوں۔ یہ نوٹ اُٹھا لو۔ یہ لو...... میرے گہنے بھی لے لو...... جان مانگو گے تو جان بھی دے دوں گی۔ بھانڈے ٹنڈر، مکان، چارپائیوں تک...... سب کچھ بیچ دوں گی پر میری بانہہ تو تھام...... مجھے انصاف دلا دے...... ہائے! میرے ربا! تم نے اس گاؤں کو اتنا بے لجا کیوں بنایا؟ کیا اس زنانیوں کے پنڈ کیلئے تمہارے پاس ایک بھی مرد نہیں تھا؟......"

اس نے چھاتی پر دو ہتڑ مارا۔ اتنے دردانگیز بین کیے کہ فہد کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل میں حبس بھر گیا۔

وہ صفیہ سے مخاطب ہوا، "آؤ میرے ساتھ!"

"فہد! خود کو اکیلا مت سمجھنا اور میں صفیہ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ابھی یہاں پر مرد ہیں۔ چلو! میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" سراج نے فہد کا ہاتھ تھام کر جذباتی لہجے میں کہا اور زمین پر بکھرے ہوئے نوٹ سمیٹ کر صفیہ کے پلو سے باندھ دیے۔ اس دوران فہد اپنی گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ صفیہ پچھلی نشست پر اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔

شہر کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنا سیل فون آن کیا۔ ساری باری شہر میں موجود میڈیا سے تعلق رکھنے والے دوستوں سے رابطہ کیا اور نئی صورت حال سے آگاہ کیا۔ شہر کا پریس مارہ کی وجہ سے اس کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو گیا۔ وہ ابھی تھانے کے قریب ہی تھا کہ مارہ کا فون آ گیا۔ کہنے لگی۔ "مجھے افسوس ہے فہد! تم نے مجھے کال نہیں کی۔ میں یہاں بیٹھ کر بھی تمہاری مدد اچھے طریقے سے کر سکتی ہوں۔"

"اوہ! مارہ پلیز ...... ناراض مت ہو۔ دراصل ایمرجنسی میں مجھے خیال نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی یہاں کے لوگ تمہاری وجہ سے ہی میری مدد کریں گے۔" اس نے بہلانے کی کوشش کی۔

وہ بہلنے کے بجائے بکھری گئی۔ بولی، "مگر مجھے بھی تو کسی مان کی ضرورت ہے ناں ...... کاش! تم مجھے احساس دلا دیتے کہ میری تمہارے نزدیک کچھ نہ کچھ اہمیت ہے۔"

"میں سوری کرتا ہوں۔" اس نے بحث میں نہ پڑنے کیلئے ہار مان لی۔

"خیر! میں جلدی تم سے رابطہ کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ شاید وہ

فہد کی گفتگو سے اندازہ کر چکی تھی کہ فہد خاصی عجلت میں تھا۔

وہ جب تھانے پہنچا، پولیس کے نمائندے موجود تھے۔ انچارج خاصا پریشان تا۔ میڈیا والوں کے پے در پے سوالات نے اُسے ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ انہیں صفائی پیش کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ فہد جب صفیہ کے ساتھ وہاں پہنچا اور اس نے ان بچوں کو بھی سامنے کھڑا کر دیا تب میڈیا شہد کی مکھیوں کی طرح ان کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ ایس ایچ او نے اُسے دفتر میں بیٹھنے کو کہا مگر اس نے کھڑے کھڑے ہی کہا۔ ''اس غریب اور بے بس خاتون کی طرف سے ایف آئی آر درج کریں ایس ایچ او صاحب! یہ خیر ور ذہن میں رکھیں کہ اس کیس کے سلسلے میں حقائق کو نہ تو مسخ کیا جا سکے گا اور نہ پیشہ ورانہ انداز میں چھپایا جا سکے گا۔'' اس کی آواز خاصی مضبوط تھی۔

''اگرچہ مجھ پر بڑا دباؤ ہے لیکن میں وہی کچھ کروں گا جو میرے پیشے کا تقاضا ہے۔ میں قانون کا سر نہیں جھکاؤں گا۔'' وہ گہری سانس لے کر بولا۔

''ٹھیک ہے۔ پھر کارروائی شروع کریں۔ دیکھا جائے گا۔'' فہد نے کہا۔

تھانہ انچارج نے صفیہ سے پوچھا۔ ''بی بی! تم کیا کہتی ہو؟''

''میرے شوہر کو چوہدری زمان نے قتل کیا ہے۔ پچھلے دو دن تک میرے سسر اور دیوروں نے مجھے روکے رکھا۔ آج جب میں نے سنا کہ پولیس نے کسی اور کو میرے شوہر کے قتل کے سلسلے میں ملزم بنا کر پکڑا ہے تو میں یہاں آ گئی ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے چوہدری زمان نے میرے شوہر کو قتل کیا تھا۔ مجھے انصاف چاہیے۔'' صفیہ نے درد انگیز انداز میں کہا۔ پھر جب تک ایف آئی آر درج نہیں ہوئی، اس کے

مؤقف کو حیطۂ تحریر میں لایا نہیں گیا، تبھی صحافی وہیں موجود رہے۔ گواہوں میں عینی شاہدین بھی شامل کیے گئے تھے۔

اس وقت وہ تھانے سے نکل چکا تھا جب مارٔہ کا فون آیا۔ فہد دیکھ رہا تھا کہ گاؤں کے لوگ سراج کی گاڑی میں بیٹھ چکے تھے اور صفیہ اس کی گاڑی میں بچوں سمیت بیٹھی ہوئی تھی، وہ خود بھی کار میں بیٹھ گیا۔ کال ریسیو کر کے بولا، "مارٔہ! میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"فہد! بہانہ بازی کرنے لگے ہو؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"نہیں! کوئی بہانہ نہیں ...... میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ فقط ایف آئی آر کٹ جانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ پھر اس سے بڑھ کر بھی بہت کچھ کرنا ہے مجھے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم مجھ سے مدد چاہ رہے ہو۔ بولو! مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

"ایک دو دن بعد یہاں گاؤں میں سیل نیٹ ورک کام کرنے لگے گا۔ پھر میں تم سے بات کروں گا۔" وہ بولا، "دراصل اس وقت تفصیلی بات کرنے کا موقع نہیں ہے۔"

"میں تمہاری کال کا انتظار کروں گی۔" مارٔہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ تمام راستے مارٔہ کے بارے ہی سوچتا رہا۔ دل کے قریب رہنے والا دکھائی نہ دے تو سوچیں خود بخود راہیں بنانے لگتی ہیں۔ گاؤں پہنچ کر اس نے صفیہ اور بچوں کو گلی کے دہانے پر

اُتارا اور ماسٹر جی کے گھر چلا گیا۔

سلمیٰ دالان میں یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے وہ اسی کی منتظر ہو۔ اسے سامنے پا کر لاشعوری طور پر کھڑی ہو گئی۔ ماسٹر دین محمد کی خالی چارپائی دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ مسجد گئے ہوں گے یا کسی سے ملنے کیلئے نکلے ہوں گے۔ تھکے تھکے انداز میں کرسی پر بیٹھ کر دھیرے سے بولا، ''کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں؟ آپ بتائیں، کیا بنا؟'' اس نے پوچھا۔

''وہی جو تم نے چاہا تھا۔ زمان کے خلاف ایف آئی آر کٹ گئی ہے لیکن اسے سزا دلوانے میں دانتوں کو پسینہ آ جائے گا۔'' وہ حقیقت پسندی سے بولا۔

''کوشش تو کی جاسکتی ہے نا؟'' اس نے امید طلب نظروں سے دیکھا۔

''ہاں! یہ تو ہے۔ تم نے اسے کیسے......''

''کیا آپ نہیں سمجھتے کہ میں بھی ظلم کے خلاف آپ کے شانہ بشانہ کھڑی ہونے کا حوصلہ رکھتی ہوں؟ کیا مجھے وہ سب کچھ نہیں سوچنا چاہیے جو آپ چاہتے ہیں؟'' سلمیٰ نے شکوہ آمیز انداز میں کہا۔ جھجک کر ہاتھ بڑھایا۔ فہد کے شانے پر رکھ کر تھوڑا دبایا۔ اس کے ہاتھ کا گرم لمس فہد کی روح تک اُتر گیا۔ اس نے سلمیٰ کو بہ نظرِ احتیاط دیکھا۔ وہ بھی اُسے دیکھ رہی تھی۔ سرخ و سپید چہرے پر سیاہ لٹ جھول رہی تھی۔ شرارت سے چھیڑ رہی تھی۔ بے ساختہ فہد نے سلمیٰ کا ہاتھ تھاما اور اپنے سامنے کرسی پر بٹھا دیا۔ بولا، ''تمہیں احساس ہے کہ محبت کتنی طاقتور ہوتی ہے؟''

''ہاں! اتنی کہ جس کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بندے کو ایک نئی زندگی دیتی ہے۔

اپنے آپ کو دوسرے کیلئے مٹا دینے کا حوصلہ بخشتی ہے۔" سلمیٰ نے دھیرے سے کہا، پلکیں جھکا لیں۔ ایسے میں اس کے چہرے پر کئی شادمانیاں اور فرحتیں اپنا آپ نچھاور کرنے لگیں۔

"سلمیٰ! تم بہت خوب صورت ہو۔" وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر یوں لگا جیسے اسی ایک جملے نے اس کی تمام تر کیفیت کو اپنے اندر چھپا لیا تھا۔

وہ مسکرائی۔ محبوبہ کے مسکرانے سے عشق کے چمن میں بہار آ جاتی ہے۔ وہ دیوانگی بھری نگاہوں سے بہار کے بھی رنگ چنتا رہا جبکہ وہ کن اکھیوں سے اُسے دیکھ کر چائے لانے کا بہانہ کر کے اُٹھ گئی۔ زندگی آتی ہے۔ زندگی جاتی ہے۔ دونوں مرحلوں کو ایک لمحے میں یکجا کیا جائے تو وہی لمحہ حاصل ہوتا ہے جو فہد کو حاصل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"چوہدری صاحب! زمان کی ضمانت ہو گئی۔ جس طرح ہوئی، میں جانتا ہوں۔ آپ بھی بے خبر نہیں ہیں۔ آگے کیا ہو گا، اس کا فیصلہ ابھی نہیں کیا جا سکتا۔" شہر کے نامور وکیل جمیل اختر نے فائل چوہدری ریاض کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ عینک اُتار کر اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ مسلسل مصروف رہنے کی وجہ سے خاصا تھک گیا تھا۔ سکھ کی بانسری سننے والے چوہدری ریاض کی سانسیں ایف آئی آر کے اندراج نے لوٹ لی تھیں۔ اس نے مصروف ترین وکیل کی خدمات حاصل کیں جس نے نہایت محنت سے زمان کی ضمانت کروائی تھی۔

"کیس بھی آپ ہی لڑیں گے۔ اپنی مدد کیلئے جتنے وکیل چاہے، ساتھ کر لیں۔ میں

سب کو فیس دے دوں گا۔'' چوہدری نے کہا۔

''یہ بات نہیں چوہدری صاحب! میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب سیاست کے وہ طریقے نہیں رہے جو آپ نے اپنا رکھے ہیں۔ اب وہ زمانہ گزر گیا ہے جب دھونس دھاندلی اور جگا گیری سے عوام پر حکمرانی کی جاتی تھی۔'' وکیل نے عینک کے موٹے شیشوں کو ٹشو پیپر سے صاف کر کے دوبارہ ناک کی پھننگی پر ٹکا لیا۔

''کچھ بھی ہو وکیل صاحب! ابھی ایک زمانے تک یہی رائج رہے گا۔ سیاسی پارٹیاں کہاں چھوٹے موٹے ورکر بندے کو آگے لاتی ہیں۔ اختیار کن لوگوں کے پاس ہے، یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس عورت کے موقف کے مطابق ایف آئی آر کے اندراج کیلئے کتنے لوگوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جبکہ ہم نے ایک ہی جلے میں ملزم کی ضمانت کروالی۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔

''لیکن یہ دیکھیں کہ اسے حمایت مل گئی ہے۔ پہلے ایسا بھی کہاں ہوتا تھا۔'' وکیل اپنے موقف سے ہٹنے پر تیار نہیں تھا۔

''آپ کی بات بجا! لیکن جس ماحول کی بات آپ کر رہے ہیں، اس کی بنیاد دیگر باتوں پر ہے۔ لوگ دال روٹی کے چکر سے نکلیں گے تو سوچیں گے۔ ماضی میں کتنے بڑے بڑے جلوس نکلا کرتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ کیوں؟ لوگوں کو روٹی کے جھمیلے فرصت ہی نہیں دیتے کہ وہ سڑکوں پر آسکیں۔'' چوہدری نے اپنی فہم و فراست کا مظاہرہ کیا۔

''مگر ایسے ہی حالات انقلاب کو جنم دیتے ہیں۔ عظیم تبدیلی آتی ہے۔ اس سے

پہلے کہ کوئی انقلاب آئے، آپ کیلئے مشکلات پیدا ہوں، آپ عوام کا دکھ بانٹنا شروع کر دیں۔ اپنی روش بدل لیں۔'' جمیل نے سمجھایا تو وہ بد لحاظ کر جھٹ سے بولا، ''میں سیاست ہی نہ چھوڑ دوں؟ خدمت کروانے کے بجائے خدمت کرنی ہو تو پھر اس رنڈی کے نخرے کیوں اٹھاؤں؟''

''آپ کی مرضی ہے چوہدری صاحب! میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ خیر! اب کیس چلے گا تو ہم دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔'' جمیل اختر نے اپنی بات سمیٹتے ہوئے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ چوہدری ریاض اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

چوہدری ریاض کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس کا سامنا ایک ذہین اور پڑھے لکھے دشمن سے پڑ گیا ہے۔ اسے احساس تو تھا کہ فہد کے آنے سے تھوڑی بہت ہلچل مچے گی لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ انہیں اپنے پسند کے میدان میں لے آئے گا۔ زمان نے جذبات میں آ کر بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس مسئلے کو حل کیسے کرنا ہوگا۔ دراصل اس نے بہت پہلے اپنے علاقے پر توجہ دینا چھوڑ دی تھی۔ سیاست کے رنگ ڈھنگ وہی تھے۔ اس کے مقابلے میں کوئی آتا ہی نہیں تھا۔ اس کے انتخابی حلقے میں شہر کی تھوڑی سی آبادی بھی پڑتی تھی۔ وہ اپنی توجہ وہیں مرکوز رکھتا تھا کیونکہ شہر میں اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنا اس کی کمزوری تھی۔ اسے یہ زعم تھا کہ اس کے تعلقات اتنے وسیع ہیں کہ اسے کہیں مشکل پیش نہیں آئے گی۔ ماضی میں ایسا ہی ہوتا رہا تھا۔ اس نے شہر کے لوگوں پر بے حد نوازشات کی تھیں۔ شہر کی سیاسی بساط پر اسے مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے فہد کی آمد کو نہایت آسان لیا تھا۔ فہد

نے اُسے بڑا اُف ٹائم دے کر اپنی حیثیت کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ اگرچہ چوہدری نے جمیل اختر کی بات رد کر دی تھی کیونکہ وہ اس کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا مگر دل میں بہت پریشان تھا۔ سوچنے پر مجبور تھا کہ اُسے فہد کا سدباب کرنا پڑے گا ورنہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

چوہدری ریاض نے اپنے مہرے بڑھا دیے۔ نمبردار کے علاوہ کئی دوسرے لوگوں کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ صفیہ کو کسی طرح صلح پر رضامند کر لیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ فوری طور پر یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ خاص طور پر اُس وقت تک جب تک صفیہ کے جذبات ٹھنڈے نہیں ہوں گے۔ اُسے یقین تھا کہ اس کے کارندے صفیہ کو صلح پر رضامند کر لیں گے۔ دوسری طرف کیس پر وہ پانی کی طرح پیسہ بہانے کا حوصلہ رکھتا تھا اور اس نے فیجے سے اقبال جرم کروا کر مقدمے میں بہت بڑی اُلجھن پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

فہد کے گاؤں سمیت پورے علاقے میں سیلولر نیٹ ورک کام کرنے لگا تھا۔ اگرچہ موبائل فون کچھ لوگوں کیلئے تو یہ کھیل تھا لیکن فہد کیلئے یہ بہت کارآمد سروس تھی۔ اس نے اپنا سیل فون آن کر کے سگنلز دیکھے اور پھر سب سے پہلی کال ماریہ کو کی، "ماریہ! میرے گاؤں سے نکل کر ہوا میں سرسرانے والی پہلی آواز تمہارے نام ہے۔"

وہ چہکی، "او واچھا! مجھے بہت اچھا لگا۔"

"کچھ ایسے ہی جذبات میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔" فہد بولا۔

"فیلکس! تمہارے چلے جانے سے جو تشنگی مجھے محسوس ہوئی، اس کا احوال بیان نہیں کر سکتی۔ تم نے مجھے مس کیا؟" وہ پیار کے جذبات سے معمور لہجے میں مستفسر ہوئی۔

وہ سنجیدہ ہو گیا، بولا: "مارژہ! کیا تم کسی ایسے شخص کے احساسات کا تعین کر سکتی ہو جسے نہ صرف اپنی ذات کو منوانا ہو بلکہ اس نے اپنے لوگوں کے وقار کو بھی تسلیم کرانا ہو۔ تم شاید اسے دماغی خلل قرار دو مگر سچ یہی ہے۔ من کی دنیا کے تقاضے عجیب ہوتے ہیں۔ ہے نا؟"

"میں کسی حد تک سمجھ رہی ہوں۔ جس بندے نے خود اپنے آپ کو مشکل میں ڈال رکھا ہو، وہاں کچھ نہ کچھ اہم تو ضرور ہوگا۔" وہ نرمی سے کہنے لگی۔

"تو پھر سمجھ لو مارژہ! میں ایسے حالات میں آ گیا ہوں جہاں میری مشکلات کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ تو طے ہے کہ میں جنگ ہار کر نہیں یہاں سے بھاگنے والا نہیں ہوں اور خود کو فنا کر دینے تک سینہ سپر رہنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔" اس نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟"

"ہاں! بہت کچھ...... اتنا، جتنا کوئی بھی نہ کر سکے۔"

"پھر مجھے بتاؤ۔ اگرچہ تم میرے سامنے نہیں ہو مگر میں تمہیں چشمِ تصور میں دیکھ رہی ہوں۔ کبھی تم سے غافل نہیں رہتی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"یہ تمہاری مہربانی ہے۔" وہ ممنونیت سے بولا۔

"نہیں! یوں اجنبیوں کی طرح بات مت کرو فہد!" مارژہ نے تڑپ کر کہا، "میں تم

سے محبت کرتی ہوں اس لیے تم سے ناخوش نہیں رہ سکتی۔ تم اگر مجھ سے دور ہو تو میری محبت مجھے تمہارے قرب میں جانے کیلئے اکساتی رہتی ہے۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہیں اس وقت رقم کی اشد ضرورت ہوگی۔" وہ عام سے انداز میں پوچھنے لگی۔

"یہ تمہیں کس نے کہہ دیا؟" وہ پھیکے پن سے ہنسا۔

"جعفر نے ......اور میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں کچھ رقم جمع کرا کر اپنا حصہ ڈال دیا ہے۔"

"اں ......یہ کیا؟ نہیں مارُہ پلیز! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں تو یہ......"

"لوٹا نہیں سکوں گا۔ یہی کہنے جا رہے تھے نا؟ ......مت لوٹانا۔ بس خود لوٹ آنا۔ اور ہاں! میں اپنی مرضی کرتی ہوں۔ ہر کام تم سے پوچھ کر نہیں کر سکتی اور جو کرتی ہوں، وہ سب کو منوا بھی لیتی ہوں۔"

"مارُہ! ایک بات اور......میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے پاپا کو راضی کرو کہ وہ یہاں پر سرمایہ کاری کریں۔ زمین میرے پاس ہے اور وہ یہاں فیکٹری لگا دیں۔ ان کے بزنس کی دیکھ بھال میں کروں گا اور انہیں نقصان نہیں ہونے دوں گا۔" فہد نے کہا۔

"سمجھو تمہارا یہ کام ہو گیا۔" مارُہ نے اطمینان سے کہا، "جعفر نے مجھے یہ بھی بتلایا ہے کہ تم کوئی سکول بنانا چاہتے ہو۔ میں نے یہاں کی ایک این جی او سے رابطہ کیا ہے۔ ان سے بات چل رہی ہے۔ مجھے توقع ہے کہ تمہارا وہ کام بھی ہو جائے گا۔ اب تم مجھے یہ بتاؤ: واپس کب آؤ گے؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کب واپسی ہو۔ ہو بھی یا نہیں۔ نجانے میرا کن حالات

سے پالا پڑے گا۔" فہد کے لہجے میں یقین کا فقدان تھا۔

"ٹھیک ہے فہد! لیکن تم یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میں یہاں تمہارا انتظار کروں گی۔"
مائرہ کو اس کے جواب سے مایوسی ہوئی تھی جو اس کے لہجے سے جھلکنے لگی تھی۔ اس نے فون بند کر دیا۔ فہد کچھ دیر خالی الذہنی کی کیفیت میں سیل فون کو گھورتا رہا پھر اسے ایک جانب اچھالتے ہوئے سوچوں میں کھو گیا۔ اسے مائرہ کی یاد آ رہی تھی اور وہ اپنی پوری شدتوں سمیت اس کی یادوں میں آ چکی تھی۔ وہ کافی دیر تک انہی یادوں سے دل بہلاتا رہا پھر سر جھٹکتے ہوئے اٹھ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے مقصد کے حصول میں کسی کمزوری واقع ہو جائے۔ وہ گاؤں کے چوک میں جا بیٹھا جہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ لوگوں پر اپنی خواہشات آشکار کرتا رہا۔ جاگیرداری کے تسلط کو توڑنے کیلئے تعلیم، روزگار اور شعور کے محاذ پر وہ کیا کرنا چاہتا تھا موزوں الفاظ میں بیان کرتا رہا۔ ایک نوخیز عمر شخص اس کی باتوں سے متاثر ہوا، بولا۔ "فہد باؤ! اگر میرا نام نہ آئے تو میں تمہیں ایک بات بتا سکتا ہوں۔"

"بولو! میرا وعدہ رہا کہ تمہارا کہیں ذکر نہیں آئے گا۔" فہد چونکا۔

"تو پھر سنو!" یہ کہتے ہوئے اس نے ارد گرد دیکھا۔ آواز کو مزید مدھم کیا اور کہا۔
"رات نمبردار اور چوہدری کے بھیجے ہوئے دو بندے صفیہ کو منانے کیلئے آئے تھے۔"

"پھر؟" فہد کی پیشانی پر تردد کی لکیریں ابھر آئیں۔

"انہوں نے بڑی رقم کا لالچ دیا۔ نعمت علی تو مان گیا کہ صلح کر لی جائے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ عدت پوری ہونے کے بعد وہ اپنے چھوٹے بیٹے سے صفیہ کا نکاح کر

دے گا۔ لیکن اس نے دونوں باتیں نہیں مانیں۔ آنے والے اُسے سوچنے کا وقت دے کر چلے گئے ہیں۔" ادھیڑ عمر شخص نے اُسے بتایا۔ فہد کے کرید نے پر تفصیل سے بتانے لگا جو اُسے اس ضمن میں معلوم تھا۔

"ٹھیک ہے چاچا! تمہاری مہربانی۔ میں اس معاملے کو دیکھتا ہوں۔" اس نے کہا تو وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ اسے امید تو تھی کی ایسی کوشش کی جائیں گی مگر اسے اتنی جلدی کی توقع نہیں تھی۔ شام ڈھل رہی تھی۔ اس لیے وہ ماسٹر دین محمد کے گھر چلا گیا۔ نلمی گویا اس کے انتظار میں تھی۔ وہ بھی پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ماسٹر دین محمد نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پوچھا، "کچھ کہنا چاہتی ہو بیٹی؟"

"جی ہاں! میں فہد کو بتانا چاہتی ہوں کہ......" یہ کہتے ہوئے اس نے وہی بات اپنے انداز میں بتائی جو فہد ادھیڑ عمر شخص کے منہ سے سن چکا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے بولی، "مگر آپ فکر نہ کریں۔ وہ لوگوں کی باتوں میں آنے والی عورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" فہد نے اختصار سے کام لیا۔ ماسٹر دین محمد اس دوران نماز پڑھنے کیلئے اُٹھ گیا تھا۔ فہد نے بھی بیرونی کمرے کا رُخ کیا۔ تھوڑی دیر بعد نلمی بھی چلی آئی، "آپ پریشان لگ رہے ہیں؟"

"ہاں نلمی! مجھے فکر ہے: کہیں صفیہ ہتھیار نہ ڈال دے۔ سارا کیا کرایا کھوہ کھاتے پڑ جائے۔"

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ آپ فراخ دلی سے صفیہ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ جب تک مضبوط رہے گی، آپ ساتھ دیتے رہیں گے۔ جونہی

تھک کر بیٹھ گئی، آپ اپنے قدم روک لیں گے۔ بس!" سلمٰی نے کہا۔

"پھر بھی......"

"پلیز! آپ پریشان نہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ صفیہ نہ تو کسی سے ڈرے گی اور نہ ہی پیسوں کا لالچ کرے گی۔ وہ اپنے شوہر سے سچی محبت کرتی تھی۔" سلمٰی نے عمومی انداز میں کہا۔ پھر شاید اُس نے اپنے لبوں سے نکلنے والے الفاظ کو دل میں دہرایا تھا، کیونکہ اس کا چہرہ ایک دم گلنار ہو گیا تھا۔ شاید سچی محبت نے اس کے پہلو میں شرارت آمیز کچوکا لگایا تھا۔

"لگتا تو یہی ہے مگر...... سلمٰی! دیکھو! اگر صفیہ نے اپنے سسر اور دیور کی بات نہ مانی تو اُس کا ٹھکانہ کیا ہو گا؟ وہ کہاں جائے گی؟" فہد نے دوسرے رُخ سے سوچ کر کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آئیں! کھانا کھائیں۔"

سلمٰی نے فہد کا ہاتھ تھام کر کھینچا۔ ایسے ہی وقت انہی کی گرفت نے دل کی کیفیت بدل دی۔ اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے فہد کے ہاتھ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ شرم سے گرفت دم توڑ گئی اور وہ جھینپے جھینپے انداز میں فہد کے آگے آگے چلتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

وقت اپنی چال سے آگے سرکتا جا رہا تھا۔ صفیہ کی عدت پوری ہو گئی تھی۔ اس دوران چوہدری ریاض کی کوششوں سے مقدمہ عدالت میں حاضریوں تک محدود رہا۔

اسے پوری توقع تھی کہ وہ بالا بالا صلح کر کے کیس ختم کر لے گا۔ اس دوران فہد سکون سے نہیں بیٹھا تھا۔ اس نے گاؤں میں موجود دو کنال جگہ پر سکول کی تعمیر کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کی عمارت تو ضرورت کے مطابق بن گئی تھی۔ سلمیٰ ہر گھر میں گئی کہ وہ اپنے بچوں اور بچیوں کو تعلیم کے حصول کیلئے سکول بھیجیں۔ مارُہ کے باپ نے اپنے چند نمائندے وہاں بھیجے تھے۔ وہ سروے کر گئے تھے۔ سروے رپورٹ اور مارُہ کی خوشی کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے وہاں سرمایہ کاری کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رقم بھی جاری کر دی تھی۔ فہد کا جعفر اور مارُہ کے ساتھ مسلسل رابطہ استوار تھا۔ فہد روزانہ گاؤں کے چوک میں بیٹھا کرتا تھا۔ فطری طور پر لوگ اس سے گپ شپ کے انداز میں تجسس سے سوال پوچھتے اور وہ لوگوں کے شعور کو اجاگر کرنے کیلئے موزوں جواب دیتا۔ وہ انہیں سمجھانا چاہتا تھا کہ خود انحصاری ترقی کا پہلا زینہ ہوتی ہے۔ اپنی ذات پر یقین رکھنے کی تلقین باتوں باتوں میں کر دیتا تھا۔ اس کی منکرانہ باتیں گاؤں سے نکل کر اطراف میں خوشبو کی طرح پھیلنے لگی تھیں۔ دھیرے دھیرے لوگوں نے علاقے میں اس کی اہمیت کو تسلیم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور وہ اپنے چھوٹے بڑے مسائل کیلئے اس سے مشاورت کرنے لگے تھے۔ وہ انہیں خلوص سے سمجھاتا۔ دیہی علاقوں میں اکثر لڑائی جھگڑے معمول کی بات تھی۔ وہ ان کا معاملہ آپس میں حل کر لینے پر زور دیتا۔ کوشش بھی کرتا۔ تھانے کچہری کے چکر میں پڑنے سے بچانے کی کوشش کرتا جس میں اکثر اوقات کامیاب رہتا۔

ایک دن سلمیٰ نے اس سے پوچھا، ”عمارت بن گئی ہے مگر سکول میں کام شروع

نہیں ہو رہا۔ کیا وجہ ہے؟"

"بس چند دن انتظار کرنا ہو گا۔ میں اس کا باقاعدہ افتتاح کراؤں گا۔ اور......" یہ کہہ کر ایک ذرا رُک کا پھر نلمی کے تجسس بھرے چہرے کو دیکھ کر بولا، "وہی دن ہو گا، جب تمہارا اور میرا حقیقی امتحان شروع ہو گا۔ تم میرے مشن میں عملی طور پر قدم رکھو گی۔"

"میرا اور آپ کا امتحان؟ حقیقی امتحان؟ میں سمجھی نہیں۔" وہ استعجاب آمیز انداز میں بولی۔

"ہاں! پھر شاید ہمیں ایک دوسرے کے پاس بیٹھنے کا وقت میسر نہ آئے۔" فہد نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"میں ایسے کسی امتحان کیلئے تیار نہیں ہوں۔" نلمی نے روٹھے انداز میں کہا تو فہد نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کہا، "نلمی! تمہاری طرح میں بھی پرسکون زندگی کا طلب گار ہوں۔ وہی زندگی جو میں نے خوابوں میں دیکھی ہے مگر میرا مقصدِ حیات کچھ اور ہے۔ تم جانتی ہو۔ تم میرا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکی ہو۔ پھر پیچھے ہٹنے کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

"لیکن ایسا تو نہیں ہے ناں کہ میں آپ کو دیکھنے کیلئے ترستی رہوں۔" اس کے لہجے میں ایک ذرا برہمی کی آمیزش تھی۔

"کیا ایک دوسرے پر یقین کی دولت کافی نہیں ہے؟" اس نے چھیڑا۔

"نہیں......" یہ کہہ کر وہ تھوڑا دور ہوئی۔ پھر چہرے پر شکایت سجائے قریب آ کر کندھے سے لگ گئی۔ دھیرے سے بولی، "آپ کے سوا مجھے کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔

آپ نے میری زندگی پر اس طرح قبضہ کیا ہے کہ مجھے اپنا وجود مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتا۔"

"تو تمہیں اتنا یقین تو ہونا ہی چاہیے کہ میرے سارے خوابوں کا ہر سلسلہ تمہاری آنکھوں سے پھوٹتا ہے۔" اس نے نیلمی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

فہد نے فقط سکول کا افتتاح ہی نہیں کیا تھا بلکہ وہ ایک ایسے ابھرتے ہوئے سیاست دان کو بھی علاقے میں متعارف کرانا چاہتا تھا جو پوری طرح چوہدریوں کے مقابلے کے لیے تیار تھا۔ سیاست دانوں میں ایک نیا طبقہ سامنے آچکا تھا جو صرف اپنی دولت کے بل بوتے پر الیکشن لڑ کر اسمبلیوں میں جا پہنچا تھا۔ انہی کی وجہ سے نہ صرف الیکشن بے حد مہنگا ہو گیا تھا بلکہ غریب سیاسی کارکنوں کے لیے آگے بڑھنے کے تمام امکانات ختم ہو کر رہ گئے۔ ملکی سیاست کے اس کلچر میں جس قدر سیاسی استحصال ہوا، شاید ہی کسی دور میں ہوا تھا۔ فہد ان معاملات کو بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایسے ہی سرمایہ کار سیاست دان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کا سوچ لیا تھا اور جیسے ہی وہ یہاں دستیاب ہوا، وہ یہاں آ گیا۔ اس نے علاقے میں بہت سارے لوگوں کو مدعو کیا ہوا تھا۔ گاؤں کو سجانے سنوارنے میں بہت سارے لوگوں نے حصہ لیا۔ دوپہر سے ذرا پہلے نعیم ایڈووکیٹ اپنی مہنگی گاڑی کے ساتھ کاروں کی لمبی قطار کے ساتھ وہاں آن موجود ہوا۔ مہمانِ خصوصی بن کر اسٹیج پر جلوہ افروز ہونے والا مقررین سے تعارف اور ایک لمبی گرانٹ کا اعلان کرنے کے بعد دوپہر کا پرتکلف کھانا کھا کر وہ چلا گیا لیکن فہد کی پوزیشن خاصی مستحکم کر گیا۔ پورے علاقے میں یہ حیرت بھری خبر گردش کر گئی کہ

چوہدری ریاض کے مقابلے کے لیے بندہ سامنے آ گیا ہے۔ چوہدری کے خلاف نفرت نے لاشعوری طور پر لوگوں میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ فہد کو یہ احساس اس طرح ہو رہا کہ علاقے بھر کے لوگ اب اس کے پاس آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ روزانہ ایک مخصوص وقت پر زیر تعمیر فیکٹری میں بیٹھتا تھا۔

صفیہ نے چوہدری کی بات بالکل نہیں مانی تھی اس لیے اس کے سر نعمت علی نے اسے الگ کر دیا۔ سلمیٰ نے اس موقع پر اسے سہارا دیا۔ اپنے سکول میں ملازمت دے کر اس کے بچوں کی مفت تعلیم کی ذمہ داری لے لی۔ صفیہ کو سہارا ملا تو وہ پہلے سے بھی مضبوط ہو کر کیس کے لگنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔

سلمیٰ کو اپنی صلاحیتیں ظاہر کرنے کا بہترین موقع ملا تھا۔ وہ صرف سکول تک ہی محدود نہیں رہی تھی بلکہ علاقے کی خواتین کی فلاح و بہبود کے کاموں میں بھی حصہ لینے لگی تھی۔ فہد قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتا تھا۔ چونکہ وہ سمجھنے والا آ گیا تھا، اس لیے سلمیٰ خود پر توجہ دینے لگی تھی جس سے اس کا حسن آنکھوں کو خیرہ کرنے لگا تھا۔

انہی دنوں اچانک ملک کے سیاسی حالات تیور بدلنے لگے۔ جنہیں دیکھتے ہوئے سمجھتے ہوئے فہد پریشان ہو گیا۔ اگرچہ وہ تبدیلی کا خواہاں تھا لیکن وہ عجلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مناسب وقت کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ انہی دنوں اسے شہر کی ایک تقریب میں مدعو کیا گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا۔ معززین شہر کے ساتھ نعیم ایڈووکیٹ بھی وہاں اس کا منتظر تھا۔ وہ بھی اپنے گروپ کو متعارف کروا رہا تھا۔ تقریب کے اختتام پر ایک بزرگ شخص نے فہد کو اپنے ہاں لنچ کی دعوت دی۔ اس نے معذرت

چاہی مگر مدعو کرنے والے کے اصرار کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں پایا۔ اس کے ساتھی نعیم ایڈووکیٹ کے ہمراہ چلے گئے جبکہ وہ شیخ امین کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گیا۔ ڈرائینگ روم میں ایک اور شخص بھی موجود تھا۔ تعارف کے بعد پتہ چلا کہ وہ شہر کا معروف وکیل جمیل اختر تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد شیخ امین بولا، "فہد صاحب! آپ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ آپ کی صلاحیتوں کا غائبانہ طور پر معترف ہو گیا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ کو یہاں آ کر بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیا آئندہ آنے والے وقت میں آپ تبدیلی کے خواہاں ہیں؟"

"میں اپنے علاقے کو خوش حال دیکھنا چاہتا ہوں اس لیے اپنی سی کوششیں کرتا رہتا ہوں۔" اس نے محتاط انداز میں کہا۔

"یہ دراصل چوہدری زمان کے وکیل ہیں اور آپ سے ملنا چاہ رہے تھے۔ میں چاہوں گا کہ آپ ان کی معروضات ٹھنڈے دل سے سن لیں۔ ماننا نہ ماننا آپ کی صوابدید پر موقوف ہوگا۔" شیخ امین نے التماس گزار انداز میں کہا۔ فہد سمجھ گیا کہ اُسے یہاں کھانے پر دعوت دینا مقصد سے خالی نہیں تھا۔

جمیل اختر بولا، "فہد صاحب! چوہدری زمان سے غلطی ہوگی۔ یقین جانیں کہ اس واقعے میں چوہدری ریاض کی ذرا سی بھی خواہش شامل نہیں تھی۔ ایک باپ کی حیثیت سے وہ اس کا دفاع کر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کی غلطی کو معاف کر دیں۔"

فہد کی مستفسر آنکھیں اُس پر جمی رہیں۔ اُس نے اپنی بات آگے بڑھائی، "اس

کے عوض آپ جو بھی چاہیں گے، آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا اور میں

ضمانت دیتا ہوں کہ چوہدری صاحب آپ کی راہ میں نہیں آئیں گے۔"

"آپ بھول رہے ہیں کہ یہ میرا اور ان کا معاملہ نہیں ہے۔ اس کیس کی مدعیہ صفیہ

بی بی ہے۔ اُس کا شوہر قتل ہوا ہے۔ چوہدری زمان قاتل ہے۔ میری کیس میں کیا

حیثیت ہے؟ آپ جانتے ہیں۔ میں تو محض صفیہ بی بی کی مدد کر رہا ہوں تا کہ اُسے

انصاف مل سکے۔ چوہدری نے اپنے طور پر صلح کی پیش کی، کوشش بھی کی مگر ان کے

درمیان معاملہ طے نہیں پا سکا۔ بس!"

جمیل اختر کائیاں شخص تھا۔ زمانہ سازی کوٹ کوٹ کر اُس کی شخصیت میں بھری

ہوئی تھی۔ بولا۔ "یہ تو ظاہر ہے کہ وہ آپ کی مدد کی وجہ ہی سے اب تک ڈٹی ہوئی ہے

ورنہ کب کی اپنے سسر کی بات مان چکی ہوتی اور یہ معاملہ ہی ختم ہو گیا ہوتا۔"

"میں بیوہ صفیہ کے معاملے میں بے بس ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ چوہدری

کس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے اور مستقبل میں کیا کرنے والا ہے۔ اس لیے

میں معذرت چاہوں گا۔ آپ مدعیہ سے خود ہی بات کر دیکھیں۔ اگر وہ صلح کرتی ہے تو

مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" فہد کے لہجے میں پختگی عیاں تھی۔

"چوہدری صاحب اپنی ماضی کی غلطیوں پر نادم ہیں اور آپ کے ساتھ اچھے

تعلقات کا آغاز چاہتے ہیں۔" جمیل اختر نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"آج نہیں تو کل، انہوں نے ایسا کرنا ہی تھا۔ آج ایسا کیوں کر رہے ہیں، اس کی

وجہ صرف اور صرف آنے والا الیکشن ہے۔ ان کی سیاسی پوزیشن پر چوہدری زمان کی

وجہ سے کافی بر اثر پڑ چکا ہے اور آنے والے انتخابات ان کے لیے بہت مشکل ہوں گے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن میری حمایت یا مخالفت ان کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ یہ تو ان کی خاندانی سیٹ ہے، نکال ہی لیں گے۔" فہد نے اپنے طور پر جانچنا چاہا کہ وہ اسے کس انداز میں لے رہے ہیں۔

"ہم آپ کی صلاحیتوں کے معترف ہو گئے ہیں۔ آپ نے علاقے میں خاصا اثر و رسوخ بنا لیا ہے۔ آپ نے جو نعیم ایڈووکیٹ کو علاقے میں متعارف کرایا، اس سے تو ہم یہی سمجھ رہے ہیں کہ آپ الیکشن لڑیں گے۔ اگر ایسی صورت حال ہے تو آپ ایک مضبوط امیدوار کے ساتھ جڑیں۔ چوہدری کے مقابلے میں نعیم کی اتنی واقفیت نہیں ہے۔" جمیل اختر نے اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ اس کے بارے میں اچھی طرح دیکھ بھال چکے تھے۔ بولا، "ٹھیک ہے۔ میں اپنے دوستوں سے مشورہ کر کے آپ کو آگاہ کر دوں گا۔"

"ہم دوستی کے منتظر ہیں۔ چوہدری زمان کا معاملہ صاف ہو جائے تو ایک دوسرے پر زیادہ اعتماد کر سکیں گے۔" جمیل اختر نے بڑے ہی نرم لہجے میں اسے باور کرا لیا کہ دوستی کی بنیادی شرط کیا ہے۔ اس دوران کھانا لگ گیا تھا۔ کھانے کے دوران وہ علاقے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ محفل خوش گوار اختتام پر پہنچ ہوئی۔

اس شام جب وہ واپس گھر پہنچا۔ ماسٹر دین محمد گھر پر موجود تھے۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ اس دوران سلمیٰ آ گئی۔ بڑے دنوں بعد اس نے سلمیٰ کو غور سے دیکھا۔ دیکھ کر نظریں ہٹانا اُس کے اختیار میں نہ رہا۔ اُس نے شہر میں رہ کر میک اپ

سے لتھڑے بنے سنورے سیکڑوں چہرے دیکھے تھے جو وقتی طور پر اچھے بھی لگتے تھے مگر ان کی کشش میں جاودانیت نہیں ہوا کرتی تھی جیسے نیلمی کے چہرے پر کشش تھی۔ اس نے حسب عادت میک اپ نہیں کیا ہوا تھا مگر اُسے کسی بناؤ کی ضرورت بھی کب تھی۔ وہ سراپا بہار تھی۔ وہ جانِ ادا تھی۔ آج کچھ بدلی ہوئی دکھائی دی۔ البتہ حسن پر متانت کی چادر تنی رہی تھی۔

وہ محفل میلاد سے واپس آئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی کھانا لگایا۔ کھانے کے بعد ماسٹر دین محمد نماز کیلئے چلے گئے تو وہ فہد کے پاس آ بیٹھی۔ فہد نے کہا۔ ''نیلمی! کیا صفیہ اب بھی اپنے شوہر کے قاتل کو سزا دلوانا چاہتی ہے؟ میرا مطلب ہے، کہیں اس کے جذبات ٹھنڈے تو نہیں ہو گئے؟''

''نہیں تو......'' وہ چونکی۔ ''اس پر دباؤ پہلا سا نہیں رہا اور وہ پہلے کی طرح مایوس بھی نہیں رہی۔ مگر بات کیا ہے؟''

''بات یہ ہے کہ چوہدری ریاض اب اپنے ہوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے۔ جب کوئی دیوار سے لگ کر بات کرتا ہے تو پھر وہ اپنی بقا کیلئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ چوہدری دیوار سے لگنے والا ہے۔''

''ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر صفیہ جب تک میرے ساتھ ہے، کسی دباؤ یا لالچ میں نہیں آئے گی۔ مجھے یقین ہے۔'' نیلمی نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''حالات بدل رہے ہیں۔ آنیوالے کچھ ہی دنوں میں کچھ بھی متوقع ہے۔ چوہدری ریاض اپنے بیٹے کو بچانے کیلئے کسی بھی انتہائی اقدام سے گریز نہیں کرے

گا۔" فہد نے تشویش سے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ہر آنے والے طوفان اور زلزلے کیلئے خود کو تیار کر چکی ہوں۔" سلمیٰ کا لہجہ مضبوط تھا۔ آنکھیں ایک دم حیا بار ہوئیں، بولی، "آپ کی محبت نے مجھے اتنا حوصلہ دیا ہے کہ میں بے خطر آگ میں کودنے پر تیار ہوں۔ میں اپنا دعویٰ وقت آنے پر ثابت کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔"

"سلمیٰ! ہم ساری زندگی حالات کو سمجھنے اور اس کے ساتھ نبرد آزمائی میں گزار دیتے ہیں۔ آسانیاں فقط اس وقت ہوتی ہیں جب ہمیں یقین اور اعتماد کی دولت میسر آتی ہے اور محبت کے دامن میں یہ طاقتیں ہوتی ہیں۔ زندگی میں ایسے دور اِسے آتے ہیں جب انسان کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنے میں مشکل محسوس کرتا ہے۔ پھر یہ محبت ہی ہوتی ہے جس کا معیار بنا کر انسان اپنے لیے فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔" فہد نے اس کی آنکھوں میں پیار سے جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرائی اور رُخ پھیر کر اُٹھ گئی۔ فہد کے دل میں اطمینان بھر گیا اور اس نے آنکھیں بند کر کے لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتاری۔

☆☆☆

سیاسی حالات اچانک پلٹ گئے اور الیکشن کی تاریخ کا اعلان ہو گیا۔ ماحول پر چھایا ہوا جمود اچانک ختم ہو کر رہ گیا۔ ہلچل مچ گئی۔ ہر جگہ یہ تبصرہ چل رہا تھا کہ آئندہ امیدوار کون ہوگا؟ کیونکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ چوہدری ریاض کے مقابلے میں نعیم ایڈووکیٹ آرہا ہے۔ اور اس دن نعیم ایڈووکیٹ نے اپنے ساتھی امیدواروں کا

حتمی فیصلہ کرنا تھا۔ شہر کے لوگ اور فہد اس میٹنگ میں شامل تھے۔

"فہد! آپ کا کیا خیال ہے کہ میں کسی سیاسی جماعت کی مدد نہیں چاہیے یا آزاد امیدوار کے طور پر ہی الیکشن لڑیں۔" نعیم ایڈووکیٹ نے پوچھا۔

"میرے خیال میں سیاسی جماعت کی مدد زیادہ ضروری ہے اور اس کا ٹکٹ ہمارے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوگا۔" اس نے اپنی رائے دی تو اس پر تبصرہ ہونے لگا۔ ذرا دیر بعد یہ فیصلہ ہو گیا کہ ٹکٹ لینی چاہیے اور چوہدری ریاض کے مقابلے میں دوسری پارٹی آسانی سے ٹکٹ دے دے گی کیونکہ آج تک ایسا ہوا نہیں، وہ بلامقابلہ منتخب ہوتا آیا تھا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد امیدواروں کے بارے میں فیصلہ کیا جانے لگا تو بڑی سیٹ پر نعیم ایڈووکیٹ ہی تھا مگر چھوٹی سیٹوں پر آ کر جو فیصلہ ہوا وہ شہر سے اقبال جمن اور دیہی علاقے سے فہد کا نام تجویز کر دیا گیا۔

"میں الیکشن نہیں لڑوں گا۔" فہد نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو سبھی حیران رہ گئے۔

"کیوں؟" سبھی نے بہ یک زبان پوچھا۔

"وہ اس لیے کہ میں کسی اور کو الیکشن لڑانا چاہتا ہوں۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"ہم نے سیٹ آپ کو دی ہے۔ آپ جسے چاہے، لڑائیں۔ بات تو ساری ووٹ کی ہے تاں......" نعیم نے کہا۔

"وہ کوئی ایسا امیدوار تو ہونا چاہیے جسے کوئی پارٹی بھی ٹکٹ دے دے۔ اس کا نام تو سامنے آنا چاہیے۔" وہاں پر موجود ایک بندے نے کہا۔

"وہ میری ذمہ داری ہے۔" فہد نے اعتماد سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

پھر دیگر معاملات زیر بحث آئے۔ جب ان کی میٹنگ ختم ہوگئی تو فہد نے مارّہ کو فون کیا۔ رسمی باتوں کے بعد مارّہ بولی، "میں چاہ رہی ہوں کہ میں تمہارے پاس آؤں۔ بہت دل چاہ رہا ہے۔ اتنا کہنے کے باوجود بھی تم نہیں آرہے ہو۔ جعفر بھی اسی ضد میں نہیں آتا۔" اس کا لہجہ شکوہ بار تھا۔

"میں چند دنوں تک تم لوگوں کو یہاں بلاؤں گا۔ بلکہ تم لوگ خود آؤ گے۔ آنا پڑے گا۔" فہد نے مسکرا کر کہا۔

"کیسی کیا خاص بات ہے؟" وہ تشویش سے بولی۔

"مجھے تم لوگوں کی مدد درکار ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"فہد! یہ تم کہہ رہے ہو؟ مجھے یقین نہیں آتا۔ میں تو یہی سمجھی تھی کہ شاید تم ہمیں کبھی یاد نہ کرو۔ مجھے بتاؤ تم نے کب آنا ہے؟"

"لیکن اس سے پہلے تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ مجھے ایک سیاسی پارٹی کی طرف سے ٹکٹ چاہیے۔ چھوٹی سیٹ کیلئے۔" اس نے پارٹی کا نام بھی بتا دیا۔

"واو! تم الیکشن لڑو گے۔ بہت خوب! ٹکٹ مل جائے اور میں آرہی ہوں ناں!" وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

"الیکشن میں نے نہیں لڑنا۔ بلکہ میں نے اپنے استاد محترم کی بیٹی نگی کو لڑانا ہے۔ اسے کامیاب بھی کرنا ہے۔" وہ مسمم انداز میں بولا۔

"کیوں؟ اسے ہی کیوں؟ ...... تم کیوں نہیں ...... وہ تو ......"

"ایک ہی بات ہے۔ مجھے بہتر اندازہ ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کیلئے مجھے کیا کرنا ہے، کسے آگے لانا ہے اور کسے پیچھے دھکیلنا ہے۔" فہد نے کہا۔

"خیر! تم واقعی بہتر جانتے ہو۔ میں شام تک تمہیں کال کروں گی۔ گڈ بائی!" نازرہ نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

اس وقت سہ پہر تھی جب وہ گاؤں پہنچا۔ سلمیٰ سکول میں تھی۔ چند دنوں سے اس نے دستکاری کا شعبہ بھی کھول رکھا تھا۔ سکول بند ہونے پر وہ لڑکیوں کو دستکاری کا درس دیتی تھی۔ فہد نے سکول کے باہر گاڑی روکی اور اس کے پاس چلا آیا۔ سلمیٰ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ "خیر تو ہے فہد؟"

"ہاں! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کیا وہ بات گھر پر نہیں ہو سکتی؟" سلمیٰ نے استعجاب سے پوچھا۔

"نہیں...... میں چاہتا ہوں کہ استاد جی کی عدم موجودگی میں بات کروں۔" فہد نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔ کہو! میں سن رہی ہوں۔" سلمیٰ سراپا سوال بن گئی۔

"یہ جو الیکشن آ رہا ہے ناں...... میں چاہتا ہوں کہ اس میں تم حصہ لو۔ چھوٹی سیٹ پر الیکشن لڑو۔"

وہ مسکرائی۔ "ٹھیک ہے۔ آپ کے حکم پر سر تسلیم خم ہے۔"

"لیکن......"

"یہ تو مجھے کہنا چاہیے تھا۔" سلمیٰ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"سنو تو سہی!" وہ بولا، "میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔ مائرہ یہاں آئے گی۔

اس کا مقصد صرف میری مدد کرنا ہوگا۔ ممکن ہے وہ کچھ......"

سلمیٰ نے بات کاٹ دی، "آپ فکر نہ کریں۔ میں اس کا پورا خیال رکھوں گی۔ وہ

اگر آپ کیلئے آرہی ہے تو اس کا مطلب ہے میرے لیے آرہی ہے۔ اس کی میزبانی

میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گی۔"

"بس! میں یہی چاہ رہا تھا۔" وہ مطمئن ہوکر بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ ٹھہریں! ہم اکٹھے ہی چلتے ہیں۔" وہ بھی کھڑی ہوگئی۔ پھر دونوں گھر پہنچے۔

ماسٹر دین محمد حسب معمول دالان میں بیٹھے کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھے۔

اس وقت اماں سلاماں گھر میں نہیں تھی۔ ان دونوں کو پہلی بار یوں اکٹھے دیکھ کر ماسٹر

دین محمد چونکا ضرور لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ وہ دونوں اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

تب فہد نے الیکشن میں حصہ لینے والی بات اپنے مخصوص انداز میں کہی۔ ماسٹر جی نے

کہا، "یہ فیصلہ تو تم کر ہی چکے ہو۔ میں دعا دے سکتا ہوں، دیتا ہوں۔"

"استاد جی! ہماری اس کوشش پر آپ دل سے کیا چاہتے ہیں؟" فہد نے ادب

سے پوچھا۔

"دیکھو بیٹا! سچائی کا جواب اگر سچائی ہوتا تو نہ صرف حالات بلکہ وقت بھی سنہرا

ہوتا۔ جھوٹ کے مقابلے میں سچائی کی جیت تو ہے لیکن اس میں بڑی مشکلات آتی حائل

ہوتی ہیں۔ اس میں کبھی ایسی راہوں پر بھی جانا پڑتا ہے جن کو دل اور مزاج قبول نہیں

کرتا۔"

"جی! آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ اندھیرے میں قندیل اُٹھانے والا تکلیف تو برداشت کرتا ہی ہے لیکن پر سکون بھی تو وہی ہوتا ہے ناں!" فہد نے رسان سے کہا۔

"ہاں! بعض اوقات ذرا سی غفلت سے ٹھوکر بھی لگ جاتی ہے۔ انسان ایک غلط فیصلے کی بدولت گمراہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا استادِ محترم!" فہد نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

"اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔" ماسٹر جی نے کہا اور بے سبب اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ وہ دونوں گھر میں تنہا رہ گئے۔ فہد جانے کیلئے پر تول رہا تھا کہ اماں سلاماں آ گئی تو وہ اطمینان سے بیرونی کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹا تو سوچوں نے اس کے ذہن کو اپنی آماجگاہ بنا لیا۔

فہد نے استادِ محترم کے گمان کو محسوس کر لیا تھا اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ ایک باپ کی سوچ تھی۔ اسے خود ہی کوئی ایسا موقعہ نہیں دینا چاہیے تھا جس سے دل میں بدگمانی پیدا ہو۔ استادِ محترم کو اس پر اعتماد تھا مگر بیٹی کا معاملہ تھا۔ وہ کچھ بھی سوچ سکتے تھے۔ اگر اسی بات کو لے کر دشمن اس کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیتے تو اس کے ساتھ ساتھ سلمٰی کے دامن پر بھی دھبہ لگ جاتا۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مگر سلمٰی سے اُس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لوگوں کے کھل جانے والے مونہوں پر ہاتھ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اسی ادھیڑبن میں پڑا رہا اور اسے وقت کا احساس نہ ہوا۔ سلمٰی اُسے کھانے کیلئے بلانے آئی۔ وہ کھانا کھا کر چائے پی رہا تھا، ماسٹر دین محمد بھی وہیں موجود تھا جب مائرہ کا فون آ گیا۔ تمہیدی باتوں کے بعد اس نے

کہا۔ "میری بات ہوگئی ہے۔ کسی بھی طرح کی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ جعفر چند دنوں بعد آ جائے گا اور میں بعد میں بھی پہنچ جاؤں گی۔"

"اچھی طرح تصدیق کرلی ہے؟" فہد نے متفکر ہوکر پوچھا۔

"اسی لیے تو بعد میں آؤں گی ورنہ کل ہی پہنچ جاتی۔" نازرہ نے کہا۔

"تم اتنی اداس کیوں لگ رہی ہو؟" فہد کو حیرانی ہوئی۔

"ایک چانس بنا تھا تمہارے پاس آنے کا اور اس میں بھی ٹکٹ کی رکاوٹ حائل ہو گئی۔ خیر! کوئی بات نہیں۔ میں بہت جلد تمہارے پاس ہوں گی۔" وہ نیم دلی سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ میں کل تم سے تفصیلاً بات کروں گا۔" فہد نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ماسٹر دین محمد نے پوچھا۔ "فہد! تم کچھ زیادہ ہی الجھ کر رہ گئے ہو۔"

"جی ہاں! مجھے یقین ہے کہ میری ریاضت اکارت نہیں جائے گی۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے استاد محترم! میں اکیلا بھی تو نہیں ہوں ناں...... بہت سارے لوگ میرے لیے نہ صرف دعا کرتے ہیں بلکہ میری اعانت بھی کرتے ہیں۔ میں لوگوں کے حقوق کیلئے جنگ لڑ رہا ہوں، میرا ضمیر مطمئن ہے اور یقیناً خدا بھی میری مدد کرے گا۔" وہ پورے شوق سے بولا۔

"میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا۔ تم اگر امیدوار ہوتے تو زیادہ اچھا تھا۔ سلمیٰ لڑکی ذات ہے۔ کامیاب ہو بھی گئی تو وہ کام نہیں کر سکے گی جو تم کر سکتے ہو۔ اس نے شہر نہیں دیکھا۔ صوبے کے دارالحکومت میں...... ایوانوں میں...... پریس کانفرنسوں میں......

کیسے جائے گی۔ نہیں بیٹا! وہ اس لائق نہیں ہے۔"

سلمیٰ قریب پہنچ گئی تھی۔ اس نے باپ کی باتیں سن لی تھیں۔ بولی، "ابا جی! ان چند مہینوں میں میں نے ایسی ایسی کہانیاں سنی ہیں کہ ان پر تبصرہ کروں تو آپ کا دل دہل جائے گا۔ لوگ کس طرح جی رہے ہیں، اب سمجھی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں ہر فورم پر جاسکوں گی اور اپنا موقف بیان کرسکوں گی۔ اگر کہیں مشکل پیش آئی تو فہد میرے ساتھ ہی ہوں گے ناں ...... میری رہنمائی کیلئے۔"

ماسٹر دین محمد کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

فہد بولا، "کچھ دنوں بعد مائرہ یہاں پہنچنے والی ہے۔ وہ الیکشن تک یہیں رہے گی۔ تمہارے پاس۔ تمہارے گھر میں۔"

"وہ تو بہت امیر ہے۔ اس کچے پکے گھر میں کیسے رہے گی؟" سلمیٰ کے لہجے میں احساس کمتری نمایاں ہو گیا۔

"رہے گی ...... کیوں نہیں رہے گی۔ سلمیٰ! اسے سب معلوم ہے اور ویسے بھی وہ امیر زادی تو ہے مگر اس کا دل غریبوں کیلئے دھڑکتا ہے۔" فہد نے پورے یقین سے کہا۔ کچھ توقف کے بعد بولا، "تم اگر چاہو تو میں تمہاری سہولت کیلئے اس کی یہاں رہائش کا موزوں ترین انتظام کردیتا ہوں۔"

وہ سمجھ گئی۔ بولی، "میں اس کے رہن سہن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ جو مناسب سمجھیں، کرلیں۔ میں ایک کمرہ اس کیلئے خالی کردیتی ہوں۔"

"شکریہ! تم آج کل میں کمرہ خالی کردینا۔ میں اسے مائرہ کے شایانِ شان

آراستہ کرادوں گا۔ فہد نے مطمئن ہو کر کہا۔

☆☆☆

چوہدری ریاض اپنے ڈیرے پر تھا۔ اس کے سامنے جمیل اختر کے علاوہ شہر سے آئے ہوئے چند لوگ براجمان تھے۔ ایک جانب زمان بھی بیٹھا تھا۔ یہ خاصی اہم میٹنگ تھی۔

"چوہدری صاحب! آپ یہ تسلیم کرلیں کہ فہد نے آپ کی سیاسی ساکھ کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اس الیکشن میں اس نے آپ کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کردی ہیں۔" جمیل اختر ایڈووکیٹ نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

"سچی بات تو یہ ہے کہ جمیل صاحب! کہ میں اسے اب تک سمجھ نہیں پایا۔ یہاں رہتے ہوئے اس نے نجانے لوگوں میں ایسا کیا پھونک دیا ہے کہ سب اس سے چمٹے رہتے ہیں۔" چوہدری کا اعتراف گویا شکست کا اعتراف تھا۔

"آپ نے اسے ایک عام پڑھا لکھا جوان سمجھنے کی غلطی کی تھی۔ میری اس سے چند ملاقاتیں ہوئی ہیں اور پھر میں نے اس کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل کی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ سیاسی ورکر......"

چوہدری نے اس کی بات کاٹ دی، "جمیل صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ یہاں کتنے سیاسی ورکر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ کیا کرلیا انہوں نے آج تک؟ کچھ بھی تو نہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سیاسی کارکن اسی وقت اہم ہوتے ہیں جب پارٹیاں انہیں تسلیم کرتی ہیں اور اہمیت دیتی ہیں۔ اتنے برس آزوی کو گزر گئے۔

سوائے الیکشن مہنگا ہونے کے اور کیا تبدیلی رونما ہوئی؟"

"یہی شکر کریں کہ سیاسی ورکر کو اپنی اہمیت کا پتہ نہیں ہے جو حقیقت میں سیاسی ورکر ہوتے ہیں وہ تبدیلی لے آتے ہیں۔ جیسا کہ فہد نے کیا۔ آج تک آپ کو سیاسی پارٹی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے آپ کو پارٹی کے شیڈ میں جانے پر مجبور کر دیا۔ ہمیں یہاں بیٹھ کر یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کامیابی کیسے ملے گی؟ اس نے مخالف امیدوار کھڑا کر دیا اور ٹکٹ بھی لے لی۔ آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ سیاسی ورکر ہے۔ نیز بھی کچھ ہے۔" جمیل اختر کے لہجے میں تندی کا عنصر غائب تھا۔

"ایک نازی لڑکی کو ٹکٹ دلوانے کا فیصلہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ فہد نے ایسا کیوں کیا؟" ایک شخص نے پیشانی سہلاتے ہوئے کہا۔

سبھی نے سر جوڑ لیا۔ اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ آدھے گھنٹے کی ذہنی مارا ماری کے بعد ایک شخص نے رائے دی۔ "دو ہی آپشن ہیں۔ یا تو فہد کو دہشت زدہ کر کے یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا جائے یا کچھ لو، کچھ دو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ڈیلنگ کی جائے۔"

جمیل اختر نے فوراً ہاتھ اٹھایا۔ "نہیں بھئی! اب دہشت پھیلانے کا وقت نہیں ہے۔ یہ ہتھکنڈہ ناکام ہو چکا ہے۔ الیکشن جیت کر کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لو بجز کر نہیں۔ عوامی ریلا فہد کے ساتھ ہے۔"

"چلو مان لیا کہ سودے بازی کر لینی چاہیے۔ مگر ایجنڈا کیا ہوگا؟" چوہدری کی پیشانی پر تردد کے بل پڑ گئے۔

تبھی سوچ میں پڑ گئے۔ ایک سیٹ پر سے گرفت ڈھیلی کرنے سے سودے بازی ممکن تھی۔ یہ کسی کو بھی گوارا نہیں تھا۔ یہ بھی زیرِ بحث آیا کہ تمام تر فساد کی جڑ، فہد کو ہی ختم کر دیا جائے۔ جہاں پہلے اتنے کیس بھگتے جا رہے ہیں، وہاں ایک اور سہی ......

جمیل اختر اس پر متفق نہیں تھا مگر میٹنگ میں شامل اکثر لوگ اس پر متفق ہو گئے۔ جمیل نے کہا، "چلیں! فہد کو راستے سے ہٹانے کے بارے سوچ لیتے ہیں مگر کیا اُسے ہمارے ارادوں کا علم نہیں ہو گا؟ ...... کیا اُس کے ہٹ جانے سے اس کے ساتھی الیکشن سے دستبردار ہو جائیں گے؟ نہیں ...... میرا خیال ہے کہ وہ مظلوم بن کر دہرا فائدہ حاصل کر لیں گے۔"

اس نے درست کہا تھا۔ سبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ایک پرانے سیاسی کھلاڑی نے سر ہلایا، کہا، "جمیل صاحب درست کہتے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں الیکشن لڑنا چاہیے۔ فہد ہماری طرح ایلیٹ کلاس سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کے چاروں طرف نوٹوں کی دیوار کھڑی کر دی جائے۔ اس کے گاؤں تک کے ووٹ خرید لیے جائیں۔ پبلسٹی فنڈز چار گنا کر دیا جائے تاکہ اس کی کمپئن دب جائے۔ ہر گاؤں کا مطالبہ مان لیا جائے۔ کچھ پارٹی فنڈز استعمال کیے جائیں، کچھ رقم اپنی گرہ سے لگائی جائے۔ چار گنا ہو کر واپس آ ہی جائے گی۔"

اس کی بات چوہدری کے دل کو لگی۔ اس نے کہا، "ہاں! یہ ہوئی نا بات ...... کیا پدی، کیا پدی کا شوربہ ...... وہ کیا الیکشن لڑے گا۔"

"اور ہاں چوہدری صاحب!" جمیل نے کہا، "چھوٹے چوہدری ذرا غصے کے تیز

واقع ہوئے ہیں۔ انہیں سمجھا دیجئے کہ یہ وقت جوش کا نہیں، ہوش کا ہے۔"

چوہدری نے مسکرا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر سب الیکشن کی تشہیری مہم کے بارے میں غور و خوض کرنے لگے۔

☆☆☆

مائرہ اس دن شہر میں پہنچی جس دن کاغذات کی جانچ پڑتال کے بعد حتمی فیصلہ ہونا تھا۔ نلمیٰ بھی شہر میں تھی۔ وہ فہد اور گاؤں کے بہت سارے لوگوں کے ساتھ وہاں پہنچی تھی۔ سہ پہر کے وقت تک حتمی فہرست ابھی جاری نہیں ہوئی تھی۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر چوہدری ریاض کے کارندے موجود تھے۔ وہ خود کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فہد کو اندیشہ تھا کہ چوہدری کے کارندے کچھ گڑبڑ کریں گے۔ اس لیے وہ بہت چوکس تھا۔ ایسے میں مائرہ کی کال آ گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ شہر پہنچ چکی تھی۔ پوچھ رہی تھی کہ فہد تک رسائی حاصل کرنے کیلئے اُسے کہاں آنا تھا۔ فہد گھبرا سا گیا۔ وہ اپنی توجہ تقسیم نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ نلمیٰ اتنے بڑے ہجوم غفیر کو دیکھ کر گھبرا رہی تھی۔

"کیا تمہارے ساتھ جعفر نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں! وہ کیوں نہیں آیا، آ کر تفصیل سے بتاؤں گی۔"

"تم سیدھی کچہری آ جاؤ۔ میں اور نلمیٰ یہاں موجود ہیں۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن راستہ...... پر ٹھیک ہے۔ میں آ رہی ہوں۔" اس نے کہا اور کال منقطع کر دی۔

کچہری کا داخلی دروازہ فہد کی نظروں سے اوجھل تھا۔ اس کا ذہن بھی مائرہ کی

طرف جاتا تھا تو کبھی یہاں کی صورت حال پر گڑبڑ اجاتا تھا۔ ایسے ہی وقت میں بالاوی نے عدالت کی دیوار پر حتمی فہرست آویزاں کر دی۔ اس کا دل خوشی سے معمور ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ ان کی سبھی درخواستیں قبول کرتے ہوئے الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

وہ پلٹا۔ ایسے ہی وقت میں اس کے سینے پر ایک ہاتھ آن ٹھہرا۔ ہاتھ رکھنے والا حلیے سے پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے نہایت شائستہ لہجے میں کہا، "آپ کو زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں فہد صاحب! اپنی طاقت سے اونچا اُڑنے والا بہت جلد گر کر مر جاتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ فہد اس کی بات کا مفہوم پوری طرح سمجھتا اور کوئی جواب دیتا، اسے کچہری کی سڑک پر جلوس آتا دکھائی دیا۔ فہد حیران ہوا کیونکہ جلوس کے شرکا کے ہاتھوں میں اسی کی پارٹی کے جھنڈے تھے۔ اس نے غور سے اگلی جیپ کی طرف دیکھا۔ مائرہ نظر آئی تو اس کے حلق سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ وہ جیپ سے اُتر کر تیزی سے کچہری کے احاطے میں داخل ہوئی۔ بے تابی سے فہد کو دیکھتی ہوئی سیدھی اُسی طرف آئی۔ اس نے خاموش مگر بڑا جاذب نظر لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ قریب آئی، گلے لگنا چاہتی تھی مگر لوگوں کی بڑی تعداد کی وجہ سے ایک ذرا قریب ہوئی، پھر ہٹ کر ہنستی ہوئی مصافحہ کیلئے ہاتھ مانگنے لگی۔ فہد نے ہاتھ ملایا۔ کہا، "مائرہ! یہ سب کیا ہے؟"

اس کا اشارہ اس بڑے جلوس کی طرف تھا جو مائرہ کے عقب میں نعرے زنی کرتا آ

رہا تھا۔

"یار! یہ ہماری روایت کا حصہ ہے۔ الیکشن کی عین ضرورت...... اور اپنی طاقت کا اظہار۔" وہ ہنستے ہوئے بولی، "اتنا حیران ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ اچھا چھوڑو! وہ اپنی سلمیٰ سے تو ملاؤ۔ بڑا اشتیاق ہے مجھے۔"

تب وہ اسے سلمیٰ کے پاس لے گیا۔ اس کا تعارف کرایا۔ دونوں نے ہاتھ ملایا اور تعارفی گفتگو کرنے لگیں۔

"ہمیں نکلنا چاہیے اب۔" سراج نے فہد کو جتلایا۔

"ہاں! کیوں نہیں۔ چلو۔" اسے کو یا ہوش آیا۔

"ادھر...... اس جیپ میں۔" مائرہ نے سلمیٰ کا ہاتھ پکڑا اور اپنی جیپ کی طرف بڑھ گئی۔ جیپ میں بیٹھ کر سن روف کھولی۔ سلمیٰ کو اپنے پہلو سے لگا کر کھڑی ہو گئی۔ جلوس جیپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ تب فہد نے فون کیا۔ "یہ کیا کر رہی ہو مائرہ؟"

"اس جیپ کا ڈرائیور یہاں کا ایک کاروباری آدمی ہے۔ یہاں بازار کا ایک چکر لگائیں گے، پھر گاؤں جائیں گے۔ فکر نہ کرو۔ پیچھے چلتے آؤ۔" مائرہ نے کہا۔

وہ شام کو گاؤں پہنچے۔ دالان میں ہی ماسٹر دین محمد کے اطراف سبھی بیٹھ گئے۔ تعارف کے بعد چائے کا دور چلا۔ مائرہ نے کہا، "اب سن لو کہ جعفر کیوں نہیں آیا؟ ظاہر ہے کہ الیکشن کے اخراجات تو بڑے ہوتے ہیں ناں...... وہ چار دنوں بعد آئے گا۔ پوسٹر اور بینرز وغیرہ لے کر۔ پاپا نے اُسے روک لیا تھا۔"

"اوہ!" فہد کے لبوں سے نکلا، "اور یہ جلوس؟"

"یار! میں نے کہا ناں کہ ذرا رعب شعب ڈالنا پڑتا ہے۔ میں صبح ہی آ گئی تھی۔ یہاں موجود اپنے لوگوں سے ملی۔ جلوس کا اہتمام کیا۔ شہر کی حد تک تو میں نے سب ہوے کر لیا ہے۔ باقی کی پلاننگ کر کے آئی ہوں جس پر ہم تفصیل سے بات کریں گے۔"

فہد کی آنکھیں بے اختیار اُس کے چہرے پر پھیر گئیں۔ وہی دھیمی دھیمی آنچ: شوخ اور رسیلے ہونٹ، سرخ و سپید چہرہ، شولڈر کٹ بال اور گداز بدن ...... جس کی لوچ لوچ میں قہر کا فساد برپا تھا۔ اُسے یوں وارفتہ نگاہوں سے دیکھتے پا کر مائرہ ایک ذرا مسکرائی، رُخ پھیر کر ماسٹر دین محمد سے باتیں کرنے لگی۔ فہد اُس کی شرارت تاڑ گیا۔ ایسے میں ماسٹر جی نے کہا، "مائرہ بیٹی! ایسے دنوں میں تو ان صحافی لوگوں کا کام بہت بڑھ جاتا ہے۔ ان کے کیریئر کیلئے ایسے مواقع بہت اہم ہوتے ہیں۔ تمہارے کام کا تو بہت حرج ہوگا ناں؟"

"انکل! اس وقت سلمیٰ کا الیکشن میرے نزدیک سب سے اہم ایشو ہے۔" مائرہ نے صدقِ دل سے کہا۔

لفظوں سے خوشبو آئی۔ فہد اور سلمیٰ نے چونک کر اُسے دیکھا۔

"مائرہ! کھانے کے بعد لمبی بات ہوگی۔ تمہیں یہاں کے بارے بہت کچھ بتاؤں گا۔ اوکے؟" فہد نے کہا، "اب تم جا کر فریش ہو جاؤ۔"

کھانے کے بعد اُس نے مائرہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "مائرہ! چوہدری کے پاس حرام کا پیسہ ہے۔ وہ اندھا دھند چارہ بنا کر ڈالنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ووٹ

خریدے گا۔ سوئنگ اور پلیاں بنوائے گا۔ لوگوں کو سبز باغ دکھائے گا۔ ہم اس کے ان ہتھکنڈوں کا مقابلہ اپنے انداز میں کریں گے۔ لوگوں کا شعور اجاگر کریں گے اور خود انحصاری کا پیغام گھر گھر تک پہنچائیں گے۔"

فہد نے پاس موجود سلمیٰ اور مائرہ کو یکے بعد دیکھا۔ کمرے میں اس وقت تینوں ہی موجود تھے۔ مائرہ بولی، "او کے یار! فکر نہ کرو۔ میں آ گئی ہوں۔ سب سنبھال لوں گی۔ سلمیٰ کو پختہ کار ریاست دان بنا دوں گی۔"

سلمیٰ نے اُسے ایک نظر دیکھا۔ دل کی دنیا تہہ وبالا ہوئی۔ سمجھ نہ پائی کہ مائرہ والے اچھی لگی تھی یا اُسے دیکھ کر دل میں جلن کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جیسے جیسے عمر بتاتی ہیں۔

☆☆☆

ہر آنے والا دن مصروف ہوتا جاتا تھا۔ جعفر آیا تو فہد کو کچھ سہارا ملا۔ مائرہ سے فون پر رابطہ رہتا تھا۔ علاقے بھر کے درودیوار پر سلمیٰ کے پوسٹر چسپاں تھے۔ الیکشن کی گہما گہمی عروج پر تھی جب پارٹی کے قائد نے اس علاقے میں انتخابی مہم کے جلسے میں اپنی آمد کا شیڈول جاری کر دیا۔ اس موقع پر بہت بڑے جلسے کا اہتمام کیا جانا ناگزیر تھا اور سراج اور جعفر نے اپنی عوامی طاقت کی نمائش کا اہتمام کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں۔ فہد تمام انتظامات کا حتمی جائزہ لینے کیلئے سراج کے ساتھ شہر جا رہا تھا۔ اچانک دو جیپوں نے راستہ مسدود کر دیا۔ جیپوں سے کئی افراد نکل کر راستے پر کھڑے ہو گئے۔ فہد نے ملگجی روشنی میں اس شخص کو پہچان لیا جس نے بڑے شائستہ انداز میں

فہد کو کچہری میں دھمکی دی تھی۔ بولا، "سراج! یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں نے بتایا تھا۔ کچہری والا۔ جعفر کو فون کرو۔"

سراج کی آنکھوں میں تشویش کے ڈورے تیر گئے۔ ایسے میں ایک آدمی نے فہد کا دروازہ بجایا، "باہر آؤ۔"

"سراج! تم باہر نہیں آؤ گے۔" فہد نے تیزی سے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

کچہری میں سینے پر ہاتھ رکھ کر دھمکانے والے نے طنز سے بھرپور لہجے میں کہا، "ادھر آؤ، میرے پاس! کہا تھا ناں کہ اونچا اُڑنے والا گر جاتا ہے۔ تو نے مارا ہوتا تو اچھا تھا۔"

"دیکھو! میرا راستہ مت روکو۔" فہد نے خود کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا، "اس وقت مجھے جلدی ہے۔ پھر کبھی راستہ روک لینا۔"

"مجھے تم سے زیادہ جلدی ہے پیارے! تمہیں ہلکا پھلکا سبق دینا چاہتا ہوں۔ کیا خیال ہے؟" اس کا لہجہ سنگین تھا۔

"تم بہت بھیانک غلطی کرو گے جو......"

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ٹھائیں کی زوردار آواز کے ساتھ راستے روکنے والے کے پستول سے گولی نکلی اور فہد کی ٹانگ میں گھس گئی۔ فہد کو جھٹکا لگا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسے میں یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ دونوں اس کی ٹانگوں میں لگے۔ وہ گاڑی کا سہارا لینے کے باوجود زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے حلق سے

کراہیں برآمد ہو رہی تھیں۔

دونوں جیپوں کے سوار آناً فاناً جیپوں میں سوار ہوئے اور اسلحہ لہراتے ہوئے چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ سراج پہلے فائر پر فہد کی تنبیہ کے باوجود گاڑی سے نکل کر اس کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ اس نے فہد کو بہ دقت اٹھا کر گاڑی میں ڈالا۔ وہ تکلیف کی شدت سے نڈھال ہو گیا تھا۔ سراج کو خالی خالی نظروں دیکھتا ہوا بے ہوش ہو گیا۔

اُسے ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا۔ اس نے اپنی دھندلی نگاہوں سے دیکھا۔ بھی اس کے گرد موجود تھے۔ وہ پہچاننے لگا۔ کچھ بولنا چاہتا تھا مگر زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کی سماعت میں اجنبی آواز اتری۔ "پلیز! آپ لوگ چلے جائیں۔ مریض کو ہوش آ گیا ہے مگر اسے ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ آپ ہمیں ڈسٹرب نہ کریں۔"

سبھی ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے۔ ڈاکٹر نے اسے پرسکون رہنے کی ہدایت کی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا گہری نیند میں چلا گیا۔ جب بیدار ہوا تو اس نے الیاس کو تسبیح پڑھتے دیکھا۔ اس کے ہلنے جلنے پر متوجہ ہوا۔ فہد نے بدقت تمام پوچھا،

"سراج کہاں ہے؟"

"ساتھ والے کمرے میں۔" الیاس نے کہا اور باہر کی جانب لپکا۔ چند لمحوں بعد مائرہ، سلمٰی، جعفر اور سراج اندر آ گئے۔ اس نے سب سے پہلے مائرہ کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔ پھر سلمٰی نظر آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ ان سب کے پریشان چہروں کو دیکھ کر بولا،

"میں ٹھیک ہوں۔"

نلمی اور مارٖہ کے لبوں سے سسکیاں نکلیں۔ جعفر دانت پیس کر بولا۔" کیسے ٹھیک ہو؟ ہیں؟ تین گولیاں لگی ہیں۔ شکر ہے کہ ہڈی بچ گئی اور تم کہہ رہے ہو کہ میں ٹھیک ہوں۔ کس نے کہا تھا کہ اکیلے جاؤ...... میں نے سمجھایا تھا تجھے......"

فہد نے مسکرانے پر اپنی تمام توانائیاں صرف کیں۔ کہا۔" چھوڑو یار...... کچھ نہیں ہوا۔ یہ بتاؤ کہ میں کہاں ہوں؟"

"تم جہنم میں ہو......" جعفر کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔

"جعفر پلیز! یہ ضلعی ہسپتال ہے۔ شہر والے ڈاکٹرز نے تمہیں یہاں ریفر کر دیا تھا۔" مارٖہ نے دخل دیا۔

"اور تم لوگ ایکشن کمپین چھوڑ کر یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"عجیب آدمی ہو تم......" جعفر بھڑک اٹھا۔

مارٖہ نے ہاتھ تھام کر دبایا۔ آنکھوں سے سمجھایا کہ یہ غصہ کرنے کا وقت نہیں ہے۔

فہد بولا۔" ڈاکٹرز مجھے دیکھ لیں گے۔ تم لوگ جاؤ۔ بہت نازک وقت ہے کمپین کیلئے۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" نلمی نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"میں بھی......" مارٖہ کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

"یعنی میرا مشن ناکام ہو گیا...... ہاں! اب مجھے مر جانا چاہیے۔" فہد کے لہجے میں عجیب یاس رچ گئی۔

نلمی تڑپی۔" نہیں! آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔ آپ کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔ میں ابھی جا رہی ہوں۔ آپ غصہ نہ کیجئے۔"

سلمیٰ نے باہر کا رخ کیا۔ سبھی نے فہد کو الوداع کہا اور کمرے سے نکل گئے۔ فہد کے لبوں پر بڑی جاندار اور طمانیت آمیز مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

☆☆☆

پچھلے پہر فہد نے سراج کے ساتھ جا کر شہر کے ایک پولنگ اسٹیشن پر ووٹ کاسٹ کیا پھر گاؤں کا رخ کیا۔ جب وہ گاؤں پہنچا، پولنگ کا وقت تمام ہو گیا تھا۔ سلمیٰ پولنگ اسٹیشن کے باہر لوگوں کے جمِ غفیر کے ہمراہ کھڑی تھی۔ چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ سراج نے فہد کو دیکھا جو بیساکھیاں سنبھال رہا تھا، "سلمیٰ تو ایک دم بدل گئی ہے۔ ہے نا؟"

فہد کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ اپنا نام شرما کر بتانے والی مردوں کے بیچ کھڑی ہاتھ لہرا لہرا کر تقریر کر رہی تھی اسے خوشی ہوئی۔ اس کا لگایا ہوا پودا تناور درخت بن گیا تھا۔

وہ بیساکھی کے سہارے کھڑا ہوا تو مارُہ نے اُسے سنبھال لیا۔ اپنے ساتھ چلاتی ہوئی سکول کی طرف بڑھی۔ سکول کے اندر بھی لوگوں کی بڑی تعداد موجود تھی جو رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے سلمیٰ بھی سکول میں آ گئی۔ فہد کرسی میں بیٹھ کر کہہ رہا تھا، "مارُہ! تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ......"

اس نے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا، کہا، "ایک لفظ بھی مت کہنا مزید ...... ہاں ...... کہے دیتی ہوں۔"

پھر سلمیٰ کو دیکھ کر بولی، "ادھر آؤ: دیکھو ...... فہد آ گیا ہے۔"

شور میں کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ حلقے کے مختلف پولنگ اسٹیشنز سے

رزلٹ موصول ہونے لگے تھے۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں خوشخبری لیے آنے لگے۔

ٹی وی اسکرین جاگ رہی تھی۔ دو بجے کے قریب ٹی وی پر غیر سرکاری نتائج کا اعلان کیا جانے لگا۔ اچانک سکول کی چاردیواری نعروں سے گونج اٹھی۔ ٹی وی پر سلمیٰ کی کامیابی کی خبر سنا دی گئی تھی۔ وہ دو ہزار تیرہ ووٹوں کی برتری سے کامیاب ہوئی تھی۔ ابھی نعیم ایڈووکیٹ کا رزلٹ نہیں مرتب ہوا تھا۔

سکول سے بلند ہونے والے نعروں نے گاؤں کی فضا میں ہلچل مچا دی۔ یوں لگا جیسے رات کے پچھلے پہر جشن بپا ہو گیا ہو۔ پورا گاؤں بیدار تھا۔ ہر طرف سے مبارک باد کی پرجوش آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ فہد کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اسے ٹانگوں کا درد بھول گیا تھا اور اچھل اچھل کر چیخ رہا تھا۔ جعفر اور مائرہ کی خوشی بھی دیدنی تھی جبکہ سلمیٰ فرطِ مسرت سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ تب نعیم ایڈووکیٹ کا نتیجہ بھی برآمد ہو گیا۔ وہ تیرہ ہزار ووٹوں کی برتری سے جیتا تھا۔

"مبارک ہو فہد صاحب! ہم جیت گئے ہیں۔"

"آپ کو بھی بہت مبارک ہو۔ میں جو آ جاؤں گا۔ اس وقت......"

"نہیں! میں یہاں کچہری میں ہی ہوں۔ اقبال چن کے بارے میں دیر لگ جائے گی۔ میں سلمیٰ بی بی کا نتیجہ لے کر ابھی آ رہا ہوں۔ میرا انتظار کریں۔"

"اب اس کا انتظار کرنا پڑے گا۔" فہد نے طویل سانس لی اور مائرہ کو ایک نظر دیکھا۔ "تب تک میں استاد جی سے مل لوں۔"

"آؤ!" یہ کہتے ہوئے وہ فوراً اٹھ گئی۔ اس نے فہد کو سہارا دے کر اٹھایا۔ سلمیٰ

بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فہد بیساکھی اٹھانے لگا تو مارُہ بولی، ''نہیں! انہیں مت اٹھاؤ، ہم ہیں نا۔''

یہ کہہ کر اس نے سلمیٰ کی جانب دیکھا۔ ایک پہلو میں مارُہ، دوسرے میں سلمیٰ ...... وہ سنبھل کر چلتا ہوا کار تک گیا۔ ایک ذرا رُک کر شوخی سے بولا، ''جن آنکھوں کے پیچھے جوان دل ہے، وہ میری بیساکھیاں دیکھ کر سوچ رہے ہیں کہ کاش! گولیاں انہیں لگی ہوتیں!''

''وہ کیوں؟'' مارُہ نہ سمجھ کر مستفسر ہوئی۔

''بے وقوف! ذرا میری بیساکھیوں پر دھیان تو دو۔''

سلمیٰ جلدی سے بولی، ''چھوڑیں بھی ...... مارُہ بھی جان بوجھ کر انجان بن رہی ہے۔''

مارُہ نے سلمیٰ کو دیکھا، ایک نظر اپنے سراپے پر ڈالی پھر مسکرا کر بولی، ''کیا تمہارا دل کر رہا ہے کہ یہ بیساکھیاں ہمیشہ تمہارے پاس رہیں؟''

وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا، ''میرے باپ کی بھی توبہ!''

سلمیٰ اور مارُہ کی ہنسیوں کی جلترنگ نے فضا نغمہ ریز کر دی۔ فہد کار میں بیٹھ گیا۔ ہر جانب روشنی تھی۔ لوگ خوشی میں رقصاں تھے۔ چند گلیاں پار کرنے کے بعد وہ گھر تک جا پہنچے۔ ان دونوں نے اسی طرح سہارا دیا اور اسے اندر لے گئیں۔ ماسٹر دین محمد جائے نماز بچھائے اپنے رب کے حضور حاضر تھے۔ وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے سلام پھیرا تو فہد نے کہا، ''استاد جی! مبارک ہو۔''

"خیر مبارک بیٹا!" انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "یہ نتائج تم لوگوں کے یقین، حوصلے اور محنت کی وجہ سے کامیابی ملی ہے۔ خوشی فطری ہے، ہونی بھی چاہیے، مگر بیٹا! یہ منزل تو نہیں ہے، یہ تو محض امتحان ہے۔ اصل کامیابی وہی ہے کہ تم لوگ اسے ایمانداری سے نبھا جاؤ۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" اس نے عزم سے کہا۔

"اب جاؤ بیٹا! آرام کرو، رات کافی بیت گئی ہے۔" وہ پیار سے بولے۔

گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوئے۔ ہاتھ ہوا میں بلند کیے۔ کانوں تک لے گئے اور با آواز بلند بولے، "اللہ اکبر!"

انہوں نے رکعت نیت لی۔ فہد کے دل سے نکلا، "اللہ سب سے بڑا ہے۔"

وہ کچھ دیر رک کر ماسٹر جی کے پرنور اور پر طمانیت چہرے کی زیارت کرنا چاہتا تھا مگر اس کی جوان بیساکھیوں نے اسے زینے میں لے کر بیڈ پر پہنچا دیا۔ اس نے یاد دلایا، "میری میڈیسن گاڑی میں ہیں۔"......

"میں لے آتی ہوں۔" نازرہ نے کہا اور باہر چلی گئی۔

اس نے دمکتے چہرے والی لیسلی کو دیکھا۔ وفورِ شوق سے بولا، "بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

وہ شرما کر چہرہ چھپا گئی۔

"کیا میں نے اس لیے اپنے دل کی بات کی ہے کہ تم چھپ جاؤ؟" وہ شرارت سے بولا۔

"نہیں ...... آپ بناتے ہیں۔"

"کسے؟ تمہیں؟ ...... نہیں بابا ...... تمہیں تو قدرت نے اتنا مکمل اور خوب صورت بنا دیا ہے کہ میرے کچھ بنانے کی ضرورت ہی نہیں۔" وہ سرشاری سے بولا۔ اُسے اُس لحظہ اپنی تکلیف بھول گئی تھی۔

"آپ کی آنکھیں خوب صورت ہیں جنہیں سب کچھ اچھا دکھائی دیتا ہے۔" وہ دانستہ طور پر آنکھیں ملانے سے کترا رہی تھی۔

"خوشی ہے کہ تمہارے اندر کیا تبدیلی آچکی ہے۔"

"میں شاید کچھ بھی نہیں رہی۔ میری ذات نفی ہو چکی ہے۔"

"یعنی ...... رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی؟" فہد نے چھیڑا۔

"ہاں ...... مجھے خبر تک نہ ہوئی کہ کب میں میں نہیں رہی، آپ ہو گئی۔ میری ذات آپ کی سوچ کا اظہار ہو گا۔" وہ بڑے وثوق اور جذب سے بولی تو آسودگی کی جاوید لہر فہد کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

اگلی صبح کے دامن میں اقتدار کا سورج چمک رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ہی آرام کر سکے تھے۔ نعیم ایڈووکیٹ کے جانے کے بعد ہی انہیں مختصر موقعہ ملا تھا۔ لوگوں کی آمد شروع ہو گئی۔ ماسٹر دین محمد کے گھر کے سامنے سرکاری گاڑیاں آگئیں کیونکہ پورے ملک میں انہی کی سیاسی جماعت جیت گئی تھی۔ حکومت کی ڈوریں اُن کی انگلیوں کا طواف کر رہی تھیں۔

خوشی سے دمکتا ہوا چہرہ لیے مائرہ کے پاپا بھی علی الصباح پہنچ گئے۔ وہ ناشتے کے

دروان ماسٹر دین محمد کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ دن خاصا چڑھ آیا۔ کمرے میں پڑے ہوئے فہد کے پاس مائرہ گئی۔ "اچھا فہد! میں اب چلتی ہوں۔"

"تم آئیں بھی اور ہم سکون سے بیٹھ کر باتیں بھی نہ کر سکے۔ پلیز! ایک آدھ دن رک جاؤ۔" فہد نے التجا کی۔

"پاپا تمہارے ساتھ فیکٹری کے معاملات ڈسکس کرنا چاہتے تھے لیکن تمہاری طبیعت کی وجہ سے شاید نہیں کریں گے۔ چند دن بعد آؤں گی تو سکون سے کہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ تب تک تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ تمہیں مریضوں کی طرح اس حال میں دیکھنا میرے لئے بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔" اس نے فہد کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر کافی دیر تک دونوں میں خاموشی حائل رہی۔

توقف کے بعد بولی۔ "اب تو ملکی کا آنا جانا لگا ہی رہے گا۔"

"ہاں! اس کا تم نے ہی خیال رکھنا ہے۔ وہ ابھی پر اعتماد نہیں ہے۔" اس نے بڑے مان سے کہا۔

"تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔" مائرہ نے فہد کا ہاتھ تھام لیا۔ "گھبراؤ مت، جعفر ابھی یہیں ہے۔ وہ تمہارا خیال رکھے گا۔" آخری لفظ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی اور وہ تیزی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

فہد کتنی ہی دیر بیڈ پر پڑا سوچتا رہا۔ خود ہی ہمت کر کے اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ مائرہ اپنے پاپا کے ساتھ جانے کیلئے تیار تھی۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلتا ہوا ان کے قریب گیا۔ مائرہ کے پاپا نے اُس کی کمر میں بازو حمائل کیا۔ پیشانی چومی اور

پیار سے کہا، "میں بہت جلدی میں ہوں۔ پھر آؤں گا۔ او کے ینگ مین؟"

"جی انکل! مجھے آپ کی ڈھارس کمزور نہیں ہونے دیتی۔"

"وہ تو مائی سن! یو آر رائٹ چیک ...... میں تمہارے ساتھ ہوں ناں۔"

انہوں نے بڑے غور سے نیلمی کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے اسے بھی گلے لگا لیا۔

فہد کے دل میں حبس بھر گیا۔ مائرہ سے جدائی کا لمحہ بڑا کٹھن تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مائرہ نے فہد کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ایسا کچھ تھا کہ وہ ٹھٹک گیا۔ جان گیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پا رہی۔

ان کے جانے پر دل گرفتہ سے فہد کو سہارا دے کر نیلمی کمرے میں لے آئی۔

☆☆☆

چوہدری ریاض اپنے ڈیرے میں تھا۔ اس کے سامنے علاقے کا ڈی ایس پی اور ساتھ ہی جمیل اختر بیٹھے تھے۔ ڈیرے کے باہر پولیس کی خاصی نفری موجود تھی۔

"چوہدری صاحب! آپ انکار کر دیں تو الگ بات ہے لیکن جس بندے نے فہد پر قاتلانہ حملہ کیا تھا، اسے یہاں دیکھا گیا ہے۔ وہ آپ کی الیکشن مہم میں حصہ لیتا رہا۔ اس کے ثبوت فوٹوز اور ویڈیو کلپس کی صورت میں ہمارے پاس پہنچ گئے ہیں اور مدعی اسے پہچان بھی چکے ہیں۔ آپ اپنی ساکھ بچائیں اور قانون کا ساتھ دیتے ہوئے اُسے ہمارے حوالے کریں۔"

"گڑ پر ہزاروں مکھیاں بھنبھناتی رہیں۔ گڑ ختم، مکھیاں غائب۔ اب میں کسے کہاں تلاش کروں؟" چوہدری نے بے پروائی سے کہا۔

"میری مجبوری یہ ہے چوہدری صاحب کہ ان کا ایک بندہ سارا دن تھانے میں رہتا ہے۔ نجانے کہاں کہاں سے ان کے فون آ رہے ہیں۔ میری پوزیشن کمزور ہو رہی ہے۔ میں ہمیشہ آپ سے تعاون کرتا آیا ہوں، اب بھی تعاون کروں گا مگر آپ میرا خیال کریں۔ میں سرکاری نوکر ہوں۔ سرکار ناراض ہو گئی تو نوکری جاتی رہے گی۔" ڈی ایس پی نے اپنی معذوری ظاہر کی۔

"مگر میں اُسے کہاں سے لاؤں جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں۔ رات گئی، بات گئی۔ دو چار چھاپے ماریں۔ روزنامچہ کالا کریں۔ اُسے اشتہاری قرار دے کر فائل بند کر دیں۔ کیا اب یہ سبق بھی مجھے ہی پڑھانا پڑیں گے؟" چوہدری کے لہجے میں گہری کاٹ تھی۔

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب! آپ کی مرضی۔ ان لوگوں نے آپ کو بھی اس معاملے میں رکھا ہوا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس بندے پر سارا ملبہ ڈال دیا جائے مگر آپ میری بات ہی نہیں سن رہے ہیں۔ میں بھی جواب دہ ہوں۔" تیزی سے بولا

"آپ اپنا کام کریں، ہم نے کب منع کیا ہے۔" چوہدری نے پھر بے پروائی سے کہا۔ "آپ کی وجہ سے چوہدری زمان والا معاملہ بھی لٹک گیا ہے۔"

"ناں چوہدری صاحب! ہم نے اپنے اختیارات سے کہیں زیادہ تگے چوہدری کو تحفظ دیا مگر اُس کی قسمت...... ہماری وردی کسی کی قسمت سے تو نہیں لڑ سکتی ناں۔"

"کہاں تحفظ دیا؟ وہ تو عدالت میں ہے۔ آپ کا تعاون مجھے حاصل ہوتا تو سارا معاملہ تھانے ہی میں رفع دفع ہو گیا ہوتا۔" چوہدری تیز لہجے میں بولا۔

بات بگڑتی دیکھ کر جمیل اختر نے فوراً کہا، "نیازی صاحب! آپ اس وقت معاملے کو رہنے دیں، میں ان سے بات کر کے آپ کے پاس آؤں گا۔ کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔"

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ کوئی تو حل ہو۔" ڈی ایس پی نے اٹھتے ہوئے کہا، "میں انتظار کروں گا۔"

وہ چلا گیا تو جمیل اختر نے نرم سے لہجے میں کہا، "چوہدری صاحب! آپ نہیں سمجھتے کہ یہ پیچیدہ قانونی معاملہ ہے۔ اس وقت لوگوں کے جذبات بھڑکے ہوئے ہیں۔ حالات آپ کے موافق نہیں ہیں۔ پھر بھی آپ وہ بندہ پولیس کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ اسے دیں اور اپنی جان چھڑائیں۔"

"کیسے؟ اس نے اپنا نہیں، میرا کام کیا ہے۔ مجھے آئندہ بھی اُس سے کام لینے ہیں۔ اگر اسے پولیس کے حوالے کر دیا تو وہ میرا نام بک دے گا۔ ڈوبتے ڈوبتے مجھے بھی لے ڈوبے گا۔" چوہدری کے لہجے میں اندیشے سرسرا رہے تھے۔

"یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ آپ اُسے اعتماد میں لے کر پولیس کی تحویل میں دیں۔ زبان بندی کی قیمت دے دیں۔ وہ مان جائے گا۔ میں اُس کی ضمانت کرا لوں گا۔" جمیل اختر نے سمجھایا۔

"اگر ایسا نہ ہوا تو؟" چوہدری نے فکرمندانہ انداز میں پوچھا۔

"پھر کیا ہوگا۔ کچھ نہیں۔ اب اس کے کہنے پر پولیس آپ کو گرفتار کرنے سے تو رہی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ فہد سے صلح کر لیں۔" جمیل اختر نے سمجھایا۔

"یعنی سر جھکا دوں؟"

"نہیں ...... میں نے یہ نہیں کہا۔ اس کی شرائط مانتا ہوں گی مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کا سر جھک جائے گا۔ معاہدوں میں جذبات کو اہمیت نہیں دی جاتی۔"

"یار! تم ہمیشہ مجھے اچھا ہی مشورہ دیتے ہو مگر یہ بات میرے دماغ میں نہیں آ رہی ہے۔ چھوڑو اس موضوع کو، کوئی اور بات کرو۔"

"میں تو ڈی ایس پی کے کہنے پر آیا تھا لیکن ...... خیر میں چلتا ہوں۔" جمیل اختر نے کہا اور ہاتھ ملا کر مایوس رخصت ہو گیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد چوہدری ریاض کافی دیر تک سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ گھوم پھر کر سوچ وہیں پر آ جاتی کہ یہ حقیقت ہے کہ فہد اب اقتدار میں ہے۔ اس کا راستہ روکنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ کامیاب ہو گیا۔ بالآخر اس سے صلح کرنا پڑے گی مگر اسے کوئی ایسا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ جس پر صلح کے ساتھ ساتھ اپنی ساکھ بھی بچا لیتا۔

☆☆☆

سلمیٰ نے حلف اٹھا لیا۔ وہ ماسٹر دین محمد اور جعفر کے ساتھ دارالحکومت گئی تھی اور وہاں پر مائرہ نے اسے سنبھال لیا تھا۔ تین دن وہیں رہنے کے بعد جس شام واپس آئے تو جعفر آتے ہی شہر چلا گیا۔ ماسٹر دین محمد کا تھکن سے برا حال تھا۔ وہ دوا پھانک کر سو گیا جبکہ سلمیٰ فہد کے پاس بیڈ پر آ بیٹھی۔ فہد نے اس کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے سوچتا تھا کہ تم سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں ہو گا۔ اب تمہیں دیکھ کر

سوچ رہا ہوں کہ تم سے بڑھ کر تم ہی خوبصورت ہو۔ حلف اٹھاتے ہی زیادہ دلکش ہو گئی ہو۔ خیر تو ہے؟"

"ہاں! مارہ مجھے بیوٹی پارلر لے گئی تھی۔" وہ شرماتے ہوئے بولی، "اچھی لگ رہی ہوں ناں؟"

"ہاں مگر......"

"کیا؟" سلمٰی نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

"تمہارے حسن کو ان لوازمات کی احتیاج نہیں ہے سلمٰی!" اس کی آنکھوں میں پیار موجزن تھا، "تم مکمل ہو...... میں سچ کہتا ہوں کہ تم حسن کا مکمل شہکار ہو۔"

"آپ کی ضرورت تو ہے نا مجھے، مارہ آپ کی بڑی تعریف کر رہی تھی۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

فہد چونکا، "کیا وہ آئے گی؟"

"ہاں! کہتو رہی تھی۔"

"کب تک؟"

"چند دنوں تک......" یہ کہہ کر وہ چند لمحے خاموش رہی پھر دبے دبے جوش سے بولی، "میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہاں جاؤں گی۔ یہ تو بس میں نے اخباروں میں دیکھا تھا۔ مجھے یقین آ رہا تھا کہ یہ میں ہوں......" یہ کہتے ہوئے وہ روئیداد سنانے لگی۔ فہد درمیان میں کوئی سوال پوچھ لیتا۔ وہ پہلے اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس دوران وہ بے خیالی میں اس کے پاس نیم دراز ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس

کے بدن کی خوشبو فہد کے نتھنوں سے ٹکرانے لگی جو اسے مدہوش کر رہی تھی۔ شاید وقت، شب اور ماحول کے ساتھ نے اُسے کچھ دلیر کر دیا تھا۔

"سلمیٰ! اب تم جاؤ اور سو جاؤ۔ رات بہت گہری ہو گئی ہے اور تم تھکی ہوئی بھی ہو۔"

"میرا سونے کو ذرا سا بھی دل نہیں چاہ رہا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ باتیں کرتی رہوں۔ سچ پوچھیں نا تو میں وہ وقت یاد کر کے بڑا عجیب سا محسوس کر رہی ہوں جب آپ نے مجھے خواب دیکھنے کو کہا تھا۔"

"ابھی تو آدھا خواب دیکھا ہے بلکہ جو میں نے خواب دیکھا ہے، ابھی تو اس کے لوازمات پورے ہوئے ہیں۔ میرے خواب میں صرف تم اور میں ہی نہیں، بہت سے لوگ شامل ہیں۔ جو ہم نے نعرے لگائے یا تقریریں کیں، یہ فرضی نہیں تھیں۔ ان پر پوری دیانت داری سے عمل کرنا ہے۔ پھر ہم خواب کا سفر طے کریں گے۔" اس نے جذباتی انداز میں کہا۔

"فہد! یہ سب ہو گا کیسے؟"

"میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔" اس نے کہا تو سلمیٰ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بے ساختہ چوم لیا۔ "آپ فکر نہ کریں......"

پھر ایک ایک بات کا ذکر کرتی رہی اور فہد اسے سمجھاتا رہا کہ مستقبل میں کیا کرنا ہے۔ انہی باتوں میں احساس ہی نہیں ہوا کہ کب صحن میں چڑیاں چہکنے لگیں۔ ماسٹر دین محمد نماز کے لیے اٹھ چکے تھے۔ وہ کسی بھی وقت سلمیٰ کو آواز دے سکتے تھے اس لیے سلمیٰ کو سنبھلنا تھا جبکہ اس کا فہد کے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ایسے لمحات میں

فہد کی فون کا بزر بج اٹھا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے۔" اس نے فون اٹھاتے ہوئے کہا پھر سکرین پر دیکھتے ہوئے تیزی سے بولا، "ارے! یہ تو جعفر ہے...... ہاں جعفر! کیسے ہو؟"

"اگر آ سکتے ہو تو شہر والے تھانے میں آ جاؤ۔" جعفر نے کہا جس کی آواز ملی بھی سن رہی تھی۔

"خیریت؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"پولیس نے اس بندے کو گرفتار کر لیا ہے جس نے تم پر تاتانہ حملہ کیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" وہ جلدی سے بولا

"چوہدری ریاض کے ڈیرے کے پاس۔ یہاں پولیس نے چھاپہ مارا ہے۔ فائرنگ ہوئی ہے اور اب چوہدری کے بیٹے زمان سمیت سب پکڑے گئے ہیں۔ ان میں اشتہاری مجرم بھی ہیں۔" وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"تو وہ! تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا......" وہ شکوہ بھرے لہجے میں بولا۔

"میں نے تو تمہیں یہ بھی نہیں بتایا کہ یہاں پر مارزہ بھی ہے، اپنی ٹیم کے ساتھ، جس نے یہ ساری کاروائی ریکارڈ کی ہے۔" وہ بولا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں! پولیس ان سب لوگوں کو لے گئی ہے، تم فوراً تھانے آ جاؤ۔" جعفر نے تیزی سے کہا۔

"وہ ٹھیک ہے، سب ہو جائے گا تم مائرہ کو ادھر بھیجو فوراً......" وہ دھاڑتے ہوئے بولا۔

"وہ تھانے میں......" اس نے کہنا چاہا تو فہد نے انتہائی غصے میں کہا۔

"بکواس بند کرو اور اسے ادھر بھیجو، پھر سب دیکھ لیتے ہیں۔"

فہد نے بلا تامل کال منقطع کر کے مائرہ کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہوتے ہی دوسری جانب سے مائرہ کی ہنستی ہوئی آواز آئی، "مجھے معلوم تھا کہ مجھے کال کرو گے۔ میں آ رہی ہوں۔ دل پر ہاتھ رکھو۔" مائرہ نے کہا اور اس کی بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔

"یا خدا! یہ لڑکی ہے یا کوئی آفت کی پرکالہ......" فہد کے لبوں سے کلمۂ تحیر برآمد ہوا۔ نیلی سے مخاطب ہوا، "تم سراج کو بلاؤ کہ وہ گاڑی لے کر آ جائے۔"

"مائرہ کا انتظار نہیں کریں گے؟" وہ استعجاب سے بولی۔

"ہاں! اس کے آتے ہی فوراً نکلنا ہوگا۔" فہد نے کہا تو وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

سیل فون فوری رابطے کا بہترین ذریعہ ہی نہیں بلکہ معاشرتی عمل کو تیز کرنے میں بھی مددگار ہے۔ چوہدری کے ڈیرے پر چھاپے اور فائرنگ کی اطلاع پورے علاقے میں جنگل کی آگ کے مانند پھیل گئی۔ لوگوں کی مسرت آمیز سرگوشیاں لہروں کی شکل میں فضا میں سرسرانے لگیں۔ ایسے میں مائرہ کی گاڑی ماسٹر دین محمد کے دروازے پر آن رکی۔ فہد صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ مائرہ کو دیکھتے ہی بولا، "مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ تم اپنی

زندگی یوں خطرے میں ڈالو گی......"

"اصل میں یہ غلطی کے آنے کے بعد آناً فاناً ہوا۔ جعفر نے یہاں رابطے تو بنا ہی لیے تھے۔ خیر! اب میں تمہارے سامنے ہوں۔"

"یو آر گریٹ ڈارلنگ!" فہد کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

"اینڈ یو آر آل سو......!" مائرہ کی مترنم آواز نے دلوں کے تار جگائے۔

"اب کیا ارادہ ہے؟" فہد نے پوچھا۔

"چلو! تھانے چلتے ہیں۔ وہاں ہمیں بہت سے کام سرانجام دینا ہیں۔"

"میں تم سے......" فہد نے کہنا چاہا لیکن سیل فون بج اٹھا۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔ دوسری جانب جمیل اختر تھا۔

فہد نے کہا، "ان حالات میں آپ کا فون آنا متوقع تھا۔ اب بتائیں، میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ میں نے آپ ہی کے کہنے پر صلح کی کوشش کی تھی مگر چوہدری کو اپنی دولت اور طاقت کا گھمنڈ تھا۔ اب نتیجہ بھگت رہا ہے۔ اسی نے فون کیا ہے کہ وہ ہر شرط ماننے پر تیار ہے۔" جمیل اختر نے بتایا۔

"اب اگر میں اُسے باہر نکلواتا ہوں تو صفیہ مجھ سے بدگمان ہو جائے گی۔"

"پلیز فہد! میری مانیں۔ میں آپ کی ہر بات چوہدری سے منوا سکتا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر...... آپ ایسا کریں کہ اُسے کہیں کہ وہ وہاں پر آجائیں جہاں اس نے میرا راستہ روکا تھا۔ پرسوں پہلے۔ اگلی بات وہیں پر ہو گی۔" یہ کہہ کر اس نے

فون بند کر دیا۔ اس وقت فہد کے اندر جیسے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ جذبات تھے کہ قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ اسے اپنے آپ پر قابو پانے میں کچھ دیر لگ گئی۔ انہی لمحات میں ماسٹر دین محمد گھر میں داخل ہوئے، مارۃ کو دیکھ کر چونک گئے اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر خیریت دریافت کرنے لگے۔ اس کی: اس کے پاپا کی ...... پوچھنے لگے،

"اس طرح ہنگامی طور پر آمد کا سبب کیا ہے بیٹی؟"

اس نے اختصار سے کام لیتے ہوئے تمام ماجرا بیان کیا۔ بولی "میرا خیال تھا کہ گاؤں میں یہ اطلاع پھیل گئی ہو گی؟ آپ کو پتہ نہیں چلا؟"

"ہاں! وہاں چوک میں لوگ جمع ہیں۔ یہی باتیں کر رہے ہیں۔" ماسٹر دین محمد نے بتایا۔

فہد نے دخل دیا، "میرا خیال ہے کہ ہمیں وہیں چلنا چاہیے استاد جی! اسی جگہ پر ...... کیکر کے نیچے ...... سڑک پر جہاں ہمارا تانگہ روکا گیا تھا۔ یاد ہے ناں آپ کو؟"

ماسٹر جی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اسے عجیب سے احساسات سے مغلوب ہو کر دیکھتے رہے پھر سوئے آسماں نظر اٹھا کر بولے، "یا پروردگار! تیرے احسانات کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ سبحان اللہ!"

کہانی جہاں سے شروع ہوتی ہے: اگر وہیں جا کر ختم ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی فطری انجام کو پہنچ گئی ہے۔ سو وہ بھی کہانی کو اس کے منطقی انجام کی طرف دھکیلتے ہوئے گاؤں سے باہر جانے والی سڑک پر پہنچ گئے۔ سورج مشرق سے ابھر رہا تھا جب فہد ببول کے درخت کے پاس جا کر رک گیا۔ اس کے پیچھے میں مارۃ نے گاڑی روک

دی۔ سائرہ کے پیچھے گاؤں کے لوگ تجسس کے مارے چلے آ رہے تھے۔

فہد گاڑی سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔ چشمِ تصور میں وہ چھریرے بدن والا لڑکا اُبھرا جو خوشی خوشی شہر کی جانب انعام حاصل کرنے نکلا تھا۔ استاد جی کا اونچا شملہ یاد آیا جسے چوہدری ریاض نے مٹی میں ملا دیا تھا۔ تبھی سامنے سے آنے والی تارکول کی سیاہ سڑک پر چوہدری کی جیپ دکھائی دی۔ اسکے ساتھ اور گاڑیاں بھی تھیں۔ وہ سب ان سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئے۔ چوہدری باہر نکلا۔ حیرت سے لوگوں کے ہجوم کو دیکھا اور ٹھٹک گیا۔ ماسٹر دین محمد کے ساتھ باقی بھی گاڑی سے باہر آ گئے۔

"ابھی وہیں کھڑے رہو چوہدری صاحب! تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" فہد نے کہا۔

"میں تو تمہارے ساتھ صلح کرنے آیا ہوں......"

"ہاں! میں جانتا ہوں مگر صلح سے پہلے کچھ یاد دلانا چاہتا ہوں تمہیں۔ یاد ہے، یہیں کھڑے ہو کر تم نے کہا تھا کہ میں کمی کمینوں سے بات نہیں کرتا۔ بولو یاد ہے۔" فہد کا لہجہ کسی بھی تاثر سے مبرا تھا۔

"ہاں یاد ہے مگر......" چوہدری نے ارد گرد دیکھا۔ بھولا ہوا قصہ آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چل پڑا۔

"اگر مگر کچھ نہیں۔ ظاہر تم مجبوری میں یہاں آئے ہو۔ ورنہ تیرے جیسا ظالم اور مغرور شخص یہاں کبھی نہ آتا۔ اسی بیٹے کی خاطر تم نے میری خوشیاں برباد کیں، میرے والدین کو یہاں سے چلے جانے پر مجبور کیا۔ پھر میرے شریف باپ کو چور بنا دیا۔

ہیں؟ اب بتاؤ؛ وہ چور تھا یا سادھ؟"

"فہد بیٹے! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔"

"نہیں ...... یہ اُسی لبادے کا وقت ہے۔ تم آج تک تم انہیں چور کہتے رہے حالانکہ سب سے بڑے تم چور ہو۔ تم حرام کھاتے ہو۔ لوگوں کی زمینوں پر ناجائز قبضے کرتے ہو۔ پنچائتوں میں نفع کماتے ہو۔ مال ڈنگر کھلواتے ہو۔ عزتوں پر رات کے اندھیرے میں ہاتھ ڈالتے ہو۔ بے قصور غریبوں کے خون سے ہاتھ رنگتے ہو۔ کون سا جرم ہے جو تمہارے کھاتے نہیں پڑا۔ سوچو!"

چوہدری ریاض کا سر جھک گیا۔ پیشانی ندامت سے اَٹ گئی۔ کچھ کہنا چاہا مگر زبان نے ساتھ نہ دیا۔ جس زمین پر وہ اکڑ کر چلتا تھا، وہی اُس کا بوجھ اٹھانے سے کترانے لگی تھی۔

فہد کہہ رہا تھا "میں اپنا ہر نقصان معاف کر سکتا ہوں لیکن تم نے میرے استاد جی کی شان میں گستاخی کی تھی ...... یہ جرم ناقابل برداشت ہے۔"

چوہدری نے دزدیدہ نظروں سے ماسٹر جی کو دیکھا۔ اردگرد موجود لوگوں پر بے تاثر نگاہ ڈالی۔ ہر وجود خاموش مگر طعنہ زن تھا۔ فہد کی روح تک کھلساتی ہوئی آواز کانوں پڑی، "چوہدری صاحب! میرے استاد جی کو راضی کر لیں۔ میں راضی ہو جاؤں گا۔"

"اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے تو میں ایسا کر لیتا ہوں مگر خدا کے لئے میرے بیٹے کو بچا لو۔ میں اسے یہاں سے دور بھجوا دوں گا۔ وہ یہاں نظر نہیں آئے گا۔" یہ کہہ کر وہ فہد کی طرف بڑھا۔ فہد نے ماسٹر جی کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا، "ادھر نہیں، اُدھر ......"

وہ شکست خوردہ انداز میں سر جھکائے ماسٹر جی کی طرف بڑھا۔ جھکنے لگا تھا کہ ماسٹر جی نے دونوں شانوں سے پکڑ کر کھڑا کر لیا۔ کہا، "بس چوہدری صاحب! میں کون ہوتا ہوں، جس کے سامنے تم جھکو...... جاؤ! اپنے سوہنے رب کے حضور جھک کر توبہ کرو، معافی مانگو، وہ معاف کرنے والا ہے۔ فہد بیٹے! میں نے اسے معاف کیا اور اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

یہ سنتے ہی چوہدری کا جھکا ہوا سر اٹھ گیا۔ اس نے حیرت سے ماسٹر دین محمد کی جانب دیکھا۔

"ایسے مت دیکھو چوہدری صاحب! ماسٹر جی کا دل دریا ہے۔ انہوں نے معاف کر دیا، اب معاف کا یہی کشکول تھام کر صفیہ بی بی کی دہلیز پر جاؤ جس کا سہاگ تمہارے فرعونی مزاج والے بیٹے نے اُجاڑ دیا تھا۔ اس کے بچوں کو یتیم کر کے دنیا کے طوفانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔"

چوہدری کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ چہرہ پیلا پڑ گیا۔ نڈھال آواز میں بولا، "مجھے اُس کے پاس لے چلو۔ میں اس کے پاؤں پڑ جاتا ہوں۔ میرے پتر نے ظلم کیا۔ وہ باہر آئے گا تو اُسے بھی صفیہ بی بی کی چوکھٹ پر معافی مانگنے لے آؤں گا۔"

اس نے گاؤں کا رُخ کیا۔ دو قدم چلا۔ ایک آواز آئی، "صفیہ بی بی تو اپنے بھائیوں کے پاس گئی ہے: اس کی بھتیجی کی شادی ہو رہی ہے۔"

چوہدری ریاض کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ سلمیٰ بولی، "کوئی بات نہیں چوہدری صاحب! آپ کو فون پر اس کی آمد کی اطلاع کر دوں گی۔ آ کر معافی مانگ

لیجئے۔ اب چاہیں تو واپس چلے جائیں۔ چاہیں تو میرے مہمان بن کر میرے گاؤں چلیں۔"

چوہدری نے نازک اندام ملکی کو دیکھا۔ وہ کتنی معتبر دکھائی دے رہی تھی۔ سر جھٹک کر اپنی جیپ کی طرف چل پڑا۔ ایسے میں پژمردہ آواز میں بولا۔ "ملکی پتر! میں آؤں گا...... مہمان بن کر آؤں گا مگر خود کو آنے کے لائق ثابت کرنے کے بعد...... خدا حافظ!"

ملکی کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ چوہدری اپنے رفقائے کار کے ساتھ چلا گیا۔

"یار! وادیہاں آؤ۔" فبدی بھرائی ہوئی آواز گونجی۔

وہ اس کے قریب گئی تو وہ بولا۔ "چند سال پہلے یہاں میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ میں ظلم کے خلاف لڑوں گا اور فتح تک ہتھیار بند رہوں گا۔"

"فتح مبارک ہو۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"تم بھی تو میرے ساتھ شامل ہو۔" وہ بولا۔

"ہاں! آئندہ بھی رہوں گی ...... اس موقعہ پر میں تمہیں ایک خوبصورت تحفہ دینا چاہتی ہوں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"وہ کیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا

"ملکی...... اس سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں جو تمہاری نذر کیا جائے۔ میں چاہوں گی کہ تم ملکی سے شادی کر لو۔" وہ تھرتھراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"یہ...... تم ...... کہہ رہی ہو؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں! میں اپنے خوابوں میں تمہارے علاوہ کسی تیسرے کا شیئر برداشت نہیں کر سکتی تھی لیکن تم اور سلمٰی بہت سارے لوگوں کے خوابوں کی تعبیر ہو۔ میری محبت تو رہے گی ہی...... مگر میں دوسروں کی محبت میں حائل نہیں ہو سکتی۔" اس کی آواز میں جذبات کی سوختہ لرزش دل کو دہلا رہی تھی۔

"مارٔہ! تمہیں سمجھنا بہت مشکل ہے......"

"ہاں! مگر سمجھنے کی کوشش کرو تو زیادہ ٹیڑھی ثابت نہیں ہوں گی۔ ہر کہانی جبر نہیں، اپنا فطری انجام مانگتی ہے اور تمہاری کہانی کا فطری انجام تمہارا اور سلمٰی کا سنگم ہے...... میں کہیں بھی نہیں......" اس کی آواز ڈوبنے لگی۔ پلکیں نم ہو گئیں۔ وہ ایڑیوں کے بل گھومی اور تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھی۔ اس نے کسی کو بھی اپنی راہ میں حائل ہونے کا موقع نہیں دیا اور چشم زدن میں گاڑی میں بیٹھ کر ہوا ہو گئی۔

فہد پھٹی پھٹی آنکھوں سے سڑک پر اڑتی ہوئی دھول کو دیکھ رہا تھا جس نے آن واحد میں مارٔہ کی گاڑی کو اپنی آغوش میں لے کر فہد کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ اس نے کب سلمٰی کے نازک ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس نے پلکوں پر آنے والے دو قطروں کو جھٹکنے کیلئے سلمٰی کے نازک ہاتھ کو پوری قوت سے بھینچ ڈالا...... شاید پیچ ڈالنا چاہتا تھا؟

☆☆☆